سیرۃ النبیؐ

رسول اللہ صلعم کے حالات و غزوات، اخلاق و عادات اور تعلیم و ارشاد کا یہ عظیم الشان کتابی ذخیرہ جسکا نام سیرۃ النبیؐ عام طور سے مشہور ہے مسلمانوں کے موجودہ ضروریات کو سامنے رکھکر صحت و اہتمام کیساتھ مرتب کیا ہے،

ابتک اس کتاب کے پانچ حصے شائع ہو چکے ہیں، پہلے میں ولادت سے لے کر فتح مکہ تک کے حالات اور غزوات ہیں، اور ابتدا میں ایک نہایت مفصل مقدمہ لکھا گیا ہے جسمیں فن سیرت کی تنقید و تاریخ ہے، دوسرے حصہ میں تکمیل دین، تاسیس حکومت الٰہی، وفات، اخلاق و عادات، اعمال و عبادات اور اہلبیت کرام کے سوانح کا مفصل بیان ہے، تیسرے حصہ میں آپکے معجزات و خصائص نبوت پر بحث ہے، اسمیں سب سے پہلے عقلی حیثیت سے معجزات پر متعدد اصولی بحثیں کیگئی ہیں، پھر ان معجزات کی تفصیل ہے جو بروایات صحیحہ ثابت ہیں، اسکے بعد ان معجزات کے متعلق غلط روایات کی تنقید و تفصیل کی گئی ہے، چوتھے حصہ میں ان اسلامی عقائد کی تشریح ہے جو آپکے ذریعہ مسلمانوں کو تعلیم کئے گئے ہیں، کوشش کی گئی ہے کہ اس میں قرآن پاک اور احادیث صحیحہ سے اسلام کے عقائد لکھے جائیں، پانچویں حصہ میں عبادت کی حقیقت، عبادات کی تفصیل و تشریح اور ان کے مصالح و حکم کا بیان ہے اور دوسرے مذاہب کے عبادات سے ان کا مقابلہ و موازنہ ہے،

چھٹا حصہ جو اخلاق پر مشتمل ہے، اس وقت زیر طبع ہے،

قیمت باختلاف کاغذ حصہ اوّل تقطیع خورد للعہ، حصہ دوم تقطیع کلاں للعہ، تقطیع خورد صہ و عہ، حصہ سوم تقطیع کلاں للعہ و للعہ، تقطیع خورد سعہ و صہ، حصہ چہارم تقطیع کلاں سعہ و سے، تقطیع خورد سعہ و صہ، حصہ پنجم تقطیع کلاں صہ و للعہ

(منیجر دار المصنفین اعظم گڈھ)

جلد ۴۲ | ماہ شوال المکرم ۱۳۵۷ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۳۸ء | عدد ۶

مضامین

شذرات

غم کمال

آخر اس عیسیٰ نفس کو بھی موت آگئی جس نے بیمار ٹرکی کو شفا، اور اس کو موت کے پنجہ سے چھڑا کر زندگی بخشی تھی، دنیا نے اس کا ماتم کیا، اور عجیب تر یہ ہے کہ انھون نے بھی اس کا ماتم کیا جنھون نے اس کو تختۂ دار پر چڑھانے مین کوئی کوشش اٹھا نہ رکھی تھی، لیکن اسکی تلوار نے ہر بیڑی کو کاٹا اور ہر زنجیر کے ٹکڑے کئے اور پرانی ٹرکی کو جلا کر اس کی راکھ سے ایک نئی ٹرکی بنا کر کھڑی کی، سنہ ۱۹۲۰ء مین کون خیال کر سکتا تھا کہ اتحادیون کے پنجۂ ستم سے بچکر یہ شکار صحیح و سلامت نکل آئے گا، مگر اس کی تدبیرون نے آخر ہر تدبیر کو شکست دی، ڈاکٹر اقبال نے سچ کہا ع

قاہری با دلبری پیغمبری است

ایسا سیاسی پیغمبر اگر کوئی ہوا ہے تو وہ مصطفیٰ کمال اتاترک تھا، جو تاج و تخت، خدم و حشم، باڈی گارڈ اور محافظون کے دستہ کے بغیر ملک پر حکمرانی کرتا تھا، اس نے اسلام کے اس سیاسی رنگ کا دھندلا سا منظر پیش کیا تھا جس کے دیکھنے کو خلافت راشدہ کے بعد سے مسلمانون کی آنکھین بیتاب تھین، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مرحوم کو اپنی مغفرت و رحمت کے فتوحات سے سرفراز فرمائے،

ہندوستان کی اسلامی دنیا گذشتہ مہینہ ایک اور صدمۂ عظیم سے دوچار ہوئی، یہ مولانا شوکت علی صاحب کی ناگہانی موت کا سانحہ ہے، یہ وہ شخصیت ہے جس نے تیس برس تک مسلمانون کی خدمت کی، وہ نہ عالم تھے، نہ مقرر تھے، نہ دولتمند تھے، وہ جیسا کہ خود کہا کرتے تھے سپاہی تھے، ان تھک کام کرنے والے، نڈر، پر دل اور پر امید، وہ کبھی کسی حال مین نا امید نہین ہوئے تھے، انکی تقریر چند فقرون کی ہوتی تھی، مگر وہ فقرے لوگون مین روح پھونک دیتے تھے، وہ اپنے ساتھیون کو بھی کبھی مایوس نہین ہونے دیتے تھے، یہ انھین کا کام تھا کہ سنہ ۱۹۲۰ء سے مرتے دم تک سارے ہندوستان کو چھان مارا تھا، تیس برس کی جانکاہ محنت کے بعد موت نے سپاہی کی کمر کھولدی اور وہ ابدی آرام کے لئے دائمی نیند سو گیا، جامع مسجد دلی کی سیڑھیان اس کا خوابگاہ بنین، چشم اعتبار اس کے لوح مزار پر یہ شعر کندہ پائیگی،

زباندانِ محبت بودہ ام دیگر نمی دانم — ہمی دانم کہ گوش از دوست پیغامے شنید اینجا

حزین از پائے رہ پیما بسے سرگشتگی دیدم — سرِ شوریدہ بر بالینِ آسایش رسید اینجا

ندیم گیا، جو صوبہ بہار مین علم و ادب کا پرانا خدمتگذار ہے، وہ ایک سال سے مولوی سید ریاست علی صاحب ندوی رفیق دار المصنفین کے ہاتھون مین ہے، وہ چاہتے ہین کہ اس رسالہ کے ذریعہ اپنے صوبہ کی علمی و ادبی خدمت کرین، اس رسالہ کے استحکام اور پریس کے قیام کے لئے انھون نے یہ تجویز کی ہے کہ پچپن پچپن روپیے کی یکمشت رقم دو سو آدمی ادارۂ ندیم کی نذر کرین اور ادارۂ ندیم تاعمر اپنا ماہوار رسالہ اور مطبوعات ان کی خدمت مین پیش کرتا رہیگا، اس تجویز پر عمل کر کے متعدد صاحبون نے اس کی ہمت افزائی کی ہے، مگر ابھی تک مطلوبہ تعداد پوری نہین ہوئی ہے، امید ہے کہ صوبہ بہار کے اہل ہمت اس ادارہ کی امداد کر کے اپنے صوبہ مین علمی و ادبی کام کرنے والون کا حوصلہ بڑھائینگے،

ہمارے پرانے مصنفین اور اہلِ قلم مین ایک نام مولوی عبدالرزاق صاحب کان پوری مصنف البرامکہ و نظام الملک طوسی کا ہے، موصوف سے میری پہلی ملاقات ۱۹۰۴ء مین اس وقت ہوئی تھی جب لکھنؤ مین مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا جلسہ تھا، جناب مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواروی ندوہ مین ٹھہرے ہوئے تھے، اتنے مین ان کی ملاقات کو مولوی عبدالرزاق صاحب آئے، شاہ صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ "یہ مولوی عبدالرزاق المتخلص بہ البرامکہ ہین" واقعی موصوف البرامکہ کے مصنف ہی کی حیثیت سے معروف ہین، اور ایک زمانہ تھا کہ المامون کے بعد البرامکہ ہماری ادبی کتابون مین سرفہرست تھی،

ایک زمانہ سے موصوف کا نام ہماری علمی دنیا سے اس طرح غائب ہے کہ اکثر لوگ یا تو ان کو بھول گئے، یا یہ سمجھ بیٹھے کہ وہ اس دنیا سے چل بسے، لیکن بحمد اللہ کہ موصوف ابھی تک زندہ اور علمی کامون مین مصروف ہین، وہ ایک زمانہ سے ریاست بھوپال مین تحصیلداری وغیرہ کی خدمتون پر رہے اور اب اعلیٰ حضرت فرمانروائے بھوپال نے ان کو اپنے ہان صیغۂ تاریخ کا مہتمم مقرر فرمایا ہے، مولوی صاحب موصوف نے اس خبر کے ساتھ بجا طور سے یہ مصرع لکھا:

عید ہوئی ذوق وے شام کو

ادارہ معارف اسلامیہ لاہور کا اجلاس اس سال دسمبر کی آخری تاریخون مین دلّی مین ہو رہا ہے امید ہے کہ اہل علم مختلف گوشون سے آکر شریک ہونگے، اور اپنے علمی مقالات پڑھین گے، دارالمصنفین کی طرف سے ناظم کے علاوہ شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی رفیق دارالمصنفین اس مین شریک ہونگے

مقالات

مقالاتِ شبلی جلد ہشتم

کا

دیباچہ

مولینا شبلی مرحوم کے مضامین کا یہ مجموعہ اُن کے متفرق اخباری مضامین، مختلف مفید تجاویز اور منصوبون پر مشتمل ہے، اس مجموعہ پر سرسری نظر ڈالنے سے مصنف کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر ایک ساتھ نظر پڑ جاتی ہے، اشاعتِ اسلام، وقفِ اولاد، اوقافِ اسلامی، تعطیلِ نماز جمعہ، مجلس علمِ کلام، اشاعتِ کتب قدیمہ، ترجمۂ انگریزی قرآن مجید، تالیف سیرت نبوی وغیرہ مختلف قومی اور مذہبی تجویزیں، انھون نے قوم کے سامنے پیش کیں، ان میں سے کچھ کو اپنی کوششوں سے پورا کر دیا، کچھ ایسی تھیں جو مناسب فضا نہ ہونے سے بارآور نہیں ہوئین،

اشاعتِ اسلام کا کام انھوں نے باقاعدہ شروع کر دیا تھا، اور مجھے میری قومی خدمت کی تعلیم کی غرض سے مددگار ناظم بنایا تھا، یاد ہوگا، کہ ۱۹۰۸ء میں ارتداد کا جو عظیم الشان طوفان اٹھا تھا اس کے مقابلہ کے لئے جو لوگ اٹھے تھے، ان میں ایک سربرآوردہ نام مولانا مرحوم کا بھی ہے، وہ شاہجہان پور وغیرہ خود دورہ کو نکلے، راجپوتانہ کے اطراف میں معتمد آدمی بھیجے، ندوہ میں سنسکرت پڑھانے کا انتظام کیا، کئی طالب علموں کو اس درجہ میں داخل کر کے ان کو اس حد تک تیار کیا، کہ اسی درجہ کے ایک مسلمان طالب علم نے شاید ۱۹۱۰ء کے ندوہ کے اجلاسِ دہلی میں جب ٹھیٹ ہندی

میں تقریر کی تو حاضرین کو اس کے پیدائشی پنڈت ہونے کا گمان ہو گیا اور وہ اس وقت دور ہوا جب لوگوں نے اس سے قرآن سنانے کی فرمایش کی، اتفاق دیکھئے کہ اس کے قرآن کا لحن بھی نہایت دلآویز تھا، اس وقت اس نے سورۂ رحمٰن کی قرأت اس خوبی سے کی کہ سارا مجمع آئینۂ حیرت تھا، دل سینوں میں تڑپ رہے تھے، اور چاروں طرف سے تعریف و تحسین اور انعامات کی بارش ہو رہی تھی،

وقفِ اولاد کا مسئلہ جس میں سرسید ناکام رہ چکے تھے، مولانا کی کوششوں سے ایسا کامیاب ہوا کہ حکومتِ وقت کو اس کے آگے سر جھکانا پڑا، اور مسٹر محمد علی جناح کی تحریک سے اسمبلی نے اسکو قانون بنانا منظور کیا،

نمازِ جمعہ کی تعطیل کے مسئلہ کو اٹھایا، اور اس حد تک اسکو گورنمنٹ سے منوالیا کہ جو مسلمان نمازِ جمعہ میں جانا چاہیں، وہ ایک مقرر وقت کے لئے جا سکتے ہیں، اسی سلسلہ میں مولینا کی ایک گفتگو یاد آئی، جن دنوں وہ اس تحریک کو چلا رہے تھے، فرمایا، بھائی اگر تعطیل منظور ہو گئی، اور مسلمان عام طور سے نماز پڑھنے نہ جائیں، تو اسلام کی کیسی بدنامی ہوگی، جہاں تک عام مسلمان ملازمین کا تعلق ہے، ان کا یہ خوف غلط نہ تھا،

ان کی سیرۃ نبوی کی تجویز ایسی سرسبز ہوئی، کہ آج ہماری زبان اس مقدس لٹریچر کی فراوانی، بلندی اور افادیت پر بجا فخر کر سکتی ہے،

عام اوقافِ اسلامی کا کام انھوں نے اخیر زندگی میں شروع کیا تھا، اور ناتمام رہا تھا، مگر اکثر صوبوں میں ان کی ناتمام کوششوں کی آواز بازگشت گونجی، اور سالہاسال کے بعد صوبوں کی حکومتوں نے اسکے متعلق اب کچھ نہ کچھ کیا ہے،

مولینا عملاً سیاسی نہ تھے، مگر اپنے خیالات میں نہایت سخت سیاسی تھے، اتحادِ عالمِ اسلامی کے وہ پہلے سفیر تھے، علما اور رہنمایانِ قوم میں سے سب سے پہلے انہی نے اسلامی ممالک

کا سفر کیا، اور سلطان ٹرکی سے اعزاز کا تمغہ پایا، جب وہ واپس آئے تو انگریزی حکومت نے ان پر کڑی نگرانی رکھی، کئی سال تک وہ جاسوسوں کے نرغہ میں رہے، اور یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ عثمانی خلافت اور اتحادِ اسلامی (پین اسلامزم) کے جس سے اوس زمانہ میں بہت کچھ ڈرا جاتا تھا، ہندوستان میں مبلغ ہیں، مسئلۂ آرمینیا پر ان کا مضمون (جو ۱۸۹۶ء میں لکھا گیا) اسی اثر کا نتیجہ ہے،

ٹرکی جانے بلکہ علیگڈھ جانے سے بھی پہلے روم و روس کی لڑائی میں ترکوں کے لئے چندہ جمع کر کے بھیجا تھا، پھر طرابلس اور بلقان کی لڑائی کے زمانہ میں ان کا جو حال تھا، اُسے اس وقت تک جب تک کہ ان کی نظم "شہر آشوب اسلام" جسکی ردیف "کب تک" ہے، موجود ہے، بھلایا نہیں جا سکتا، لکھنؤ کے جس جلسہ میں انھوں نے یہ نظم پڑھی تھی، یہ کہنا چاہئے کہ وہ طرابلس اور بلقان کی ہمدردی کا جلسہ نہ تھا، مجلسِ ماتم تھی، اس زمانہ میں ان پر اتنا گہرا اثر تھا، کہ وہ ذرا ذرا سی بات پر رو دیتے تھے، اور کبھی کبھی جب کوئی خوشی کی خبر آتی، تو بہت خوش بھی ہو جاتے تھے،

اس زمانہ کا ایک واقعہ یاد آیا، ایک رات کو کوئی دس بجے کے قریب مجھے اور ندوہ کے بعض طالب علموں کو یاد فرمایا، اس ناوقت کی طلب سے ہم لوگ گھبرا گئے، پہنچے تو دیکھا، کہ سامنے مصر کے عربی اخبارات پڑے ہوئے ہیں، اور مولانا بہت خوش ہیں، فرمایا کہ ابھی ابھی مصر کے نئے اخبارات پڑھ رہا تھا یہ خبر پڑھکر بہت خوشی ہوئی، کہ ترکوں نے طرابلس کو خودمختار بنایا، اور انور بے نے ترکوں کی فوجی ملازمت سے استعفا دیکر طرابلس کی خودمختار حکومت کی سربراہی قبول کر لی، اکیلے خوشی مناتے نہیں بنتا تھا، اسلئے تم لوگوں کو بلایا، اسکے بعد اسی وقت بازار سے مٹھائی منگوائی، اور ہم لوگوں کو کھلائی،

مولینا گو کالج میں سرسید کے ساتھ رہتے تھے، مگر مذہبی اختلاف کے ساتھ ساتھ موصوف کو سرسید کے آخری سیاسی خیالات سے حد درجہ اختلاف تھا، اور اسکو وہ ہندوستانیوں، اور

مسلمانوں کے حق میں بہت مضر سمجھتے تھے، بلکہ علانیہ وہ کانگریس کی حمایت کرتے تھے، اور اس وقت کی کانگریس کے خیالات سے پوری طرح متفق تھے، دونوں بزرگوں کا یہ سیاسی اختلاف بہت حد تک اُن کے تعلقات کو کشیدہ کرنے میں معین ثابت ہوا،

مولانا فرماتے تھے، کہ ایک دفعہ یونین میں جمہوریت اور شخصی بادشاہی کے عنوان پر طالبعلموں کا مناظرانہ مکالمہ تھا، سرسید، مولینا اور دوسرے استاد بھی شریک تھے، مولینا نے جمہوریت کی تائید میں زبردست تقریر فرمائی، جلسہ ختم ہوگیا، اور لوگ اپنے اپنے ٹھکانے چلے گئے، صبح کو جب مولینا سرسید سے ملے، تو سرسید نے کہا آپ نے مجھے رات بہت تکلیف پہنچائی، رات مجھکو اس وقت تک نیند نہیں آئی، جب تک کہ میں نے آپ کی تقریر کے جواب میں ایک مضمون لکھکر آپ کے دلائل کی تردید نہ کرلی،

۱۹۱۲ء میں تقسیم بنگالہ کی تنسیخ اور طرابلس و بلقان اور مسجد کانپور کے ہنگاموں کی بدولت مسلمانوں کے ہیجان کے زمانہ میں سب سے پہلا مضمون جس نے مسلمانوں کے سیاسی خیالات کا رُخ بدل دیا، مولینا کے قلم سے نکلا تھا، جسکی سرخی "مسلمانوں کی پولٹیکل کروٹ" ہے، اسی کے ساتھ یا اسی کے قریب قریب زمانہ میں دوسرا انقلاب انگیز مضمون نواب وقار الملک مرحوم کا تھا، جس میں تقسیم بنگال کی تنسیخ پر غم و غصہ کا اظہار تھا، مولینا نے اس مضمون کا ذکر کیا تھا، اور اسکو بہادرانہ مضمون فرمایا تھا،

اس زمانہ میں مسٹر محمد علی جینا کی سرکردگی میں مسلم لیگ نے "سوٹ ایبل گورنمنٹ" کی تجویز منظور کی تھی، مولینا اس قید کے سخت مخالف تھے، اس وقت مسلم لیگ پر ان کی جو نظمیں چھپیں، اور جو ان کے اردو کلیات میں موجود ہیں، وہ اُن کے خیالات کی آئینہ دار ہیں، ان نظموں کو یہ مقبولیت حاصل تھی، کہ جس ہفتہ اخبارات میں ان کی کوئی نظم شائع ہوتی تھی، تو وہ بچہ

بچہ کی زبان پر آجاتی تھی،

مسجد کانپور کے ہنگامہ میں ان کی نظموں نے مسلمانوں کے جذبات میں آگ لگا دی تھی،

ع:- ہم کشتگان معرکہ کانپور ہیں

والی نظم تو ہندوستان کے اس سرے سے اس سرے تک ایک ایک مسلمان بچہ کی زبان پر تھی،

۱۹۱۲ء میں جو بڑا انقلاب انگیز سال تھا، مسلمانوں کی آزاد اخبار نویسی کا سال آغاز بنے جب لاہور سے زمیندار نے رنگ پلٹا، اور کلکتہ میں الہلال نمودار ہوا، تو وسط ہند کیسے خالی رہتا، چنانچہ لکھنؤ میں سید میر جان کی کوشش سے مولینا کے زیر مشورہ مسلم گزٹ نکلا، مولینا اس میں کبھی نام سے اور کبھی بے نام مضمون لکھتے تھے، مولوی وحید الدین صاحب سلیم مرحوم کو اسکی اڈیٹری کے لئے مولینا ہی نے بلوایا تھا،

انگریزی ترجمۂ قرآن کی تجویز قریب قریب پوری ہو چکی تھی، نواب عماد الملک بلگرامی نے جو اپنے زمانہ کے بے نظیر انگریزی انشا پرداز تھے، مولینا کی تحریک سے پندرہ پاروں تک ترجمہ کر چکے تھے، جو مطبوعہ مسودہ کی صورت میں اب بھی موجود ہے، پھر مولینا حمید الدین صاحب مرحوم جب دار العلوم حیدرآباد میں پرنسپل ہو کر گئے، تو نواب صاحب نے ان کے مشورہ و استصواب سے اپنے ترجمہ کے کئی پاروں پر نظر ثانی کی، مگر نواب صاحب کی وفات کے بعد جب میں نے یہ مسودہ نواب صاحب مرحوم کے خلف الرشید نواب مہدی یار جنگ بہادر وزیر سیاسیات و تعلیمات سرکار نظام سے منگوا بھیجا تو اس نظر ثانی شدہ مسودہ کا پتہ نہ چلا جس کا بہت افسوس ہے،

صفحہ ۵۶ پر ایک "اہم تجویز" کے نام سے ۱۱ فروری ۱۹۱۴ء میں دار المصنفین کا تخیل پیش کیا تھا، وہ اسکی فکر میں تھے، کہ اسی سال نومبر ۱۹۱۴ء میں انھوں نے وفات پائی، ان کے بعد اس

تجویز کو عملی صورت میں جس طرح لایا گیا وہ آپ کے سامنے ہے،

ندوہ کی تعمیرات کی تجویزوں کے سلسلہ میں انھیں بڑی کامیابی ہوئی، ان کی تجویز کو پڑھکر والی بھاولپور کی جدّ محترمہ مرحومہ نے پچاس ہزار روپے یکمشت دیدیئے، دارالاقامہ کی تحریک کا یہ اثر ہوا کہ خود انھوں نے اور ان کے متعدد دوستوں نے اپنے اپنے نام کے کمروں کیلئے ایک ایک ہزار دیئے، جن سے ندوہ کے موجودہ بورڈنگ کے کچھ کمرے بنے ہوں گے،

ندوہ کے فارغ شدہ طلبہ کی دستاربندی کا جلسہ جسکی تحریک ص ۴۹۰ پر درج ہے، نہایت کامیابی سے ہوا، یہی جلسہ میری علمی کامیابیوں کا دیباچہ ہے، استاذ نے خوش ہوکر اپنے سر سے پگڑی اتار کر بھرے جلسہ میں شاگرد کے سر پر باندھی، واقعہ کی تفصیلات دارالعلوم کی اس سال کی روداد میں درج ہیں،

قدیم عربی کتابوں کی اشاعت کی جو تجویز انھوں نے ۱۸۹۶ء میں پیش کی تھی، گو اس وقت پوری نہیں ہوئی، لیکن عجیب بات ہے کہ جن قلمی کتابوں کی اشاعت کا نام انھوں نے لیا تھا، ان میں سے ایک (مناقب شافعی للرازی) کے سوا سب کتابیں انکی زندگی میں چھپ گئیں، اور وہ دائرۃ المعارف جسکے کام سے ان کو مایوسی تھی، ان کے حبیب صمیم اور بانی کار کے خلف الرشید اور ان کی درسگاہ کے چند تعلیم یافتوں کے ہاتھوں اسکی ایسی کایا پلٹ ہوئی، کہ اس باب میں مولانا مرحوم کے اکثر ارادے پورے ہوگئے،

علم کلام کی مجلس خط و کتابت سے آگے نہیں بڑھی،

اس میں ایک مضمون المامون کی کسی تنقید کے جواب میں ہے، مولینا مرحوم کی عادت یہ تھی، کہ ان کی کتابوں پر جو تنقیدیں لکھی جاتی تھیں، وہ ان کا جواب نہیں دیتے تھے، اخیر زمانہ میں جب "طالب العلم" کے نام سے ہمارے "فلسفی دوست" مولینا عبدالماجد کی

نہایت سخت تنقید الناظر میں مولینا کی تصنیف الکلام پر شائع ہوئی، تو مجھے سخت غصہ آیا، اور اسی حالت میں میں مولینا کے پاس آیا، اور یہ سمجھا کہ جب میرا یہ حال ہے، تو مولانا کا کیا حال ہوگا، مگر دیکھا کہ دریا کی سطح بالکل ساکن ہے، میں نے بڑے جوش سے جواب لکھنے کی تجویز کی، تو میری ساری گرم گفتگو کا جواب اس مختصر سے ٹھنڈے فقرہ میں دیا، جو وقت اس میں خرچ کیا جائے، اس میں کوئی اور نیا کام کیوں نہ کر لیا جائے"!

اس کلیہ میں صرف ایک استثنا ہے، اور وہ المامون پر ایک تنقید کا جواب ہے، یہ تنقید اس نوجوان کے قلم سے نکلی تھی، جو اب نواب صدر یار جنگ بہادر کے خطاب سے مخاطب ہیں، مولینا کا جواب ۲۲ فروری ۱۸۸۹ء کے اخبار آزاد لکھنؤ میں شائع ہوا تھا، جس کے اڈیٹر شوق قدوائی مرحوم تھے، جواب کا لہجہ گو تلخ ہے، مگر یہ تلخی کیسی خوشگوار تھی، کہ اسی تعلق سے ایک نے دوسرے کو پہچانا، اور اس کے بعد مولینا کی تصنیفات پر تقریظ و تنقید فاضل شروانی کے بدیع الاسلوب قلم کا دلچسپ کارنامہ بن گئی،

یہ مضامین جو متفرق اخباروں اور رسالوں سے بمشکل جمع کئے گئے ہین، حق یہ ہے کہ اس مشکل کام کی انجام دہی کا سہرا مولینا کے ایک معتقد ندوی مولوی معین الدین صاحب قدوائی (بارہ بنکی) کے سر ہے، اب اتنے دنوں میں وہ کچھ سے کچھ ہوگئے، اور زمینداری کے کاروبار نے اس مذاق سے ان کو دور کر دیا ہے، مگر ان کا یہ کام یادگار رہے گا،

سیرت سید رشید رضا

(۲)

از

مولینا مسعود عالم ندوی کیٹلاگر اورنٹیل لائبریری پٹنہ وسابق مدیر الضیا

شیخ محمد عبدہ اور سید رشید رضا

دنیا میں نیرنگیِ اخلاق کے نمونے بھی عجیب وغریب نظر آتے ہیں شاگرد ایسے بھی ہوتے ہیں جو بھولنے پھلنے کے بعد استاذ ومربی کا نام بھی نہیں لیتے اور ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنے ہر قول وعمل کی نسبت استاذ کی طرف کرتے ہیں، اور استاذ ہی کو اپنی تمام نیکیوں کا سرچشمہ قرار دیتے ہیں، امام سید رشید رضا کا تعلق آخری گروہ سے تھا، وہ مسلسل پینتیس سال "استاذ امام" کا کلمہ پڑھتے رہے، بلکہ کہنا چاہئے کہ انھوں نے اپنی شخصیت شیخ عبدہ کی ذات میں گم کردی تھی، یہ تم ظریفی نہیں تو اور کیا ہے، کہ آج امام سید رشید رضا کی توصیف میں شیخ محمد عبدہ کا خلیفہ کہنا کافی سمجھا جاتا ہے، حالانکہ سید رشید مختلف حیثیتوں سے استاذ پر سبقت لے گئے تھے، جیسا کہ اہل نظر سے[1] پوشیدہ نہیں، یہ موقع اس بحث کا نہیں ہے، بلکہ اُن حالات پر روشنی ڈالنا مقصود ہے جنکے ماتحت طرابلس الشام کا سیدزادہ گھربار چھوڑ کر مصر کو اپنا وطن بنانے پر مجبور ہوا، اور انتہائی ناموافق ماحول کے باوجود

[1] راقم الحروف کی یہ رائے وصہ سے ہے، حسن اتفاق کہ خود امیر البیان نے بھی اپنی ایک تحریر میں ایک گونہ اسکی تائید کی ہے، ان کی رائے میں عقلی علوم اور خطابت میں شیخ محمد عبدہ کا پلہ بھاری تھا، اور نقلی علوم دانشا میں سید رشید کا مرتبہ بلند تھا، (ص ۲-۲۵۵)

اس نے اپنی ساری زندگی خدمتِ اسلام کے لئے وقف کردی،

سید رشید ابھی طرابلس الشام میں طلب علم کی ابتدائی منزلیں طے کر رہے تھے، کہ دنیائے اسلام میں سید جمال الدین کا غلغلہ بلند ہوا، پھر کچھ دنوں بعد جب العروۃ الوثقیٰ کی اشاعت ہوئی، تو استعماری قوتوں کی بنیادیں ہلنے لگیں، اہل حق کے دلوں میں جنبش پیدا ہوئی، یہ ایک مقناطیسی قوت تھی، جو نوجوانوں اور جوان ہمت بوڑھوں کو اپنی طرف کھینچ رہی تھی، سید رشید بھی ان چند "سابقین اولین" میں تھے، جن کے دل العروۃ الوثقیٰ کی پہلی آواز سے متاثر ہوئے، اور یہیں سے سید جمال الدین اور ان کے دست راست شیخ محمد عبدہ کے ساتھ ان کی عقیدت شروع ہوتی ہے، رفتہ رفتہ یہ عقیدت ولولۂ جہاد اور جوشِ عمل میں تبدیل ہوتی گئی، سید رشید نے پہلے پہل سید جمال الدین کو ۱۳۱۰ھ میں عقیدتمندانہ خط لکھکر استفادہ اور رفاقت کی تمنا ظاہر کی تھی، سید جمال الدین کی صحبت سے استفادہ کا موقع تو مرحوم کو نہ ملا، لیکن شیخ محمد عبدہ سے ملنے کے مواقع برابر ملتے رہے، پہلی ملاقات طرابلس میں ہوئی، گو اس ملاقات میں گفتگو کا موقع کم ملا، لیکن عقیدت مند کی عقیدت میں اور اضافہ ہوگیا، اس کے تھوڑے دنوں بعد شیخ محمد عبدہ پھر طرابلس تشریف لائے، اس مرتبہ قیام ذرا طویل ہوا، اس قیام میں سید رشید برابر ان کی خدمت میں حاضر ہوتے، اور ان کی صحبت سے مستفید ہوتے رہے، مختلف قسم کے سوال کرتے، اور تشفی بخش جواب پاکر خوش ہوتے،[1]

۱۳۱۰ھ سے ۱۳۱۴ھ تک سید رشید کا ذوق وشوق بڑھتا رہا، ابھی سید جمال الدین سے ملنے کی توقع باقی تھی، کہ شوال ۱۳۱۴ھ (مارچ ۱۸۹۶ء) یہ امید ہمیشہ کے لئے منقطع ہوگئی، مشرق کا بیدارکنندہ سلطان عبد الحمید[2] کی عنایت سے آستانہ میں ہمیشہ کے لئے محو خواب ہوگیا...... اب سید رشید رضا کی

[1] ان ملاقاتوں کی تفصیل تاریخ الاستاذ الامام جلد اول میں ملے گی، [2] سید جمال الدین کی موت کا مسئلہ بہت پیچیدہ ہے، امیر شکیب ارسلان نے سلطان عبد الحمید کو بری ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، (ملاحظہ ہو حاضر العالم الاسلامی تذکرہ سید جمال الدین)

بیتابی بڑھی، والدین کو کسی نہ کسی طرح راضی کر کے چپ چاپ مصر پہنچ گئے، اور شیخ محمد عبدہ کی خدمت میں یک بیک حاضر ہوئے، اور صاف صاف عرض مدعا کیا،

"میری غرض صرف آپ سے استفادہ کرنا ہے، میری رائے میں آپ ہی مسلمانوں کی ٹوٹی ہوئی کشتی کا سہارا ہیں" (ص ۱۰۱)

گفتگو دیر تک رہی، شیخ نے فرمایا "مسلمان تو اپنے مستقبل سے مایوس ہیں، صرف مجھے انکی کامرانی کا پورا یقین ہے، میرے علاوہ مصر میں صرف ایک[1] آدمی ایسا ہے، جس سے آدھی توقع ہے"۔

اس گفتگو کے بعد استاذ و شاگرد میں روزانہ مبادلۂ خیالات ہونے لگا، دونوں اکثر مسائل میں متفق الرائے تھے، فرقۂ بہائیہ اور بعض دوسرے مسئلوں میں اختلاف بھی تھا، رفتہ رفتہ تعلقات مستحکم ہوتے گئے، آخر شعبان ۱۳۱۵ھ میں "المنار" کے اجراء کی تجویز بھی مرتب ہو گئی، سید رشید نے استاذ امام کی نگرانی قبول کی، پیر و مرید کی طرح دونوں میں معاہدہ ہوا، استقلالِ فکر کے سرگرم حامی، شاگرد کا عہد نامہ سننے کے لائق ہے:-

"میں عہد کرتا ہوں کہ صوفیوں کے طریقہ کے مطابق ایک مرید کیطرح آپکا متبع رہوں گا، لیکن میری ایک شرط ہے جس کا حق مجھے برابر حاصل رہے گا، وہ یہ کہ جو بات میری عقل سے باہر ہو گی، اسکی حکمت دریافت کروں گا، اور جو چیز میرے سمجھ میں نہیں آئے گی، اسے قبول نہیں کروں گا، اور وہی کام کروں گا، جسکے فائدہ کا مجھے یقین ہو گا"

ان اسال عن حکمۃ مالا اعقلہ ولا اقبل الا ما افہمہ ولا افعل الا ما اعتقد فائدتہ (ص ۱۰۵)

"المنار" کے اجراء کے بعد علمی و اصلاحی اتحاد عمل کے ساتھ ساتھ ذاتی تعلقات بھی گہرے ہوتے گئے،

---

[1] یہ شیخ عبدالکریم سلمان کی طرف اشارہ تھا، (سید رشید)

شیخ محمد عبدہ کا اعتماد شاگرد پر اتنا بڑھ گیا تھا کہ تمام راز کی باتیں ان سے کہتے، نجی امور میں مشورہ کرتے اخبارات میں بعض مضامین کی ان کے ذریعہ خفیہ تردید کراتے، انہیں شاگرد سے صرف ایک مسئلہ میں اختلاف تھا، وہ ترکی حکومت کے خلاف کچھ لکھنا پسند نہیں کرتے تھے، سید رشید قلم کو روکتے تھے لیکن کبھی کبھی جذبات استاد کی نصیحت پر غالب آجاتے، مرحوم نے خود کسی جگہ لکھا ہے،

"عثمانی حکومت کے خلاف جی بھر کے لکھنے کا موقع استاذ امام کی وفات کے بعد ہی ملا"[1]

رجب ۱۳۱۵ھ میں یا اسکے لگ بھگ سید رشید استاذ امام کی خدمت میں مصر حاضر ہوئے، ۱۳۲۳ھ میں شیخ محمد عبدہ نے داعی اجل کو لبیک کہا، شاگرد رشید جذبہ شوق میں مصر گیا تھا، چنانچہ ذوقِ خدمت میں وہیں کا ہو رہا، بارہ سال کی رفاقت میں محمد عبدہ اور رشید رضا کی روحیں تحلیل ہو کر باہم ایک ہو گئی تھیں مرض الموت میں شیخ محمد عبدہ کے دل سے کچھ شعر نکلے، جو ان کے خیالات کا آئینہ اور استاذ و شاگرد کے باہمی تعلق و وحدتِ فکر کے بہترین شاہد ہیں:-

ولستُ اُبالی ان یقال محمد — أبَلّ او اکتظت الیه المآتم

مجھے اس کی پرواہ نہیں، کہ محمد عبدہ کی صحت کی خبر دی جائے یا اس کے ماتم میں خلقت کا ہجوم ہو

ولکنہ دین اردت صلاحہ — أحاذر ان تقضی علیہ العمائم

لیکن (صرف) "دین" کا خیال ہے، جس کی بھلائی کی میں نے (بڑی) کوشش کی، ڈر ہے کہیں "عمامے" (علماء) اس کا خاتمہ نہ کر دیں،

فیارب ان قدرت رُجعی قریبۃ — الی عالم الارواح وانفض خاتم

الٰہی اگر میرا سفر آخرت قریب ہے، اور اگر میری زندگی کا سربمہر لفافہ ٹوٹ چکا ہے،

فبارک علی الاسلام وارزقہ مرشدا — رشیدا "یضیٔ النہج واللیل قاتم"

تو اسلام پر نگاہ کرم کر، اور اسے (یعنی دین اسلام کو) ایسا "رشید" (صالح) رہنما عطا کر، جو رات

---

[1] المنار ۱۳۲۳ھ،

(گمراہی) کی تاریکیوں میں (لوگوں کو) راہ حق دکھا سکے۔ (ص ۱۸۰)

مشہور ہے کہ جب سید رشید کے استاذ الاستاذ اور شیخ محمد عبدہ کے مرشد، حکیم مشرق امام الاحرار سید جمال الدین افغانی کو مصر چھوڑنا پڑا، تو لوگوں نے دریافت کیا "آپ ہمیں کیا کہتے ہیں؟ اور پوری قوم کو کس پر چھوڑتے ہیں؟" جواب ملا "محمد عبدہ کو چھوڑ رہا ہوں، وہ مصر کے لئے کافی ہے" حکیم مشرق کے قول کی تصدیق مصر کی گذشتہ چالیس سالہ تاریخ دیکھتی ہے، اسی محمد عبدہ کے آغوش تربیت میں سعد زغلول، عبدالکریم سلمان، عبدالعزیز شاویش، قاسم امین، شیخ علی یوسف پروان چڑھے، اور پھولے پھلے، اور شیخ محمد عبدہ کے شاگردوں ہی کے ہاتھوں مصر کے سیاسی و اجتماعی انقلابات کی تکمیل ہوئی، شیخ محمد عبدہ کے رفیق اور تحریک اعرابی کے سرگرم لیڈر، مشہور ادیب و وزیر محمود سامی باشا بارودی جب سیلون کی جلاوطنی سے مصر واپس گئے، تو انھوں نے بھی بالکل اسی طرح شیخ محمد عبدہ سے بھی ملاقات میں سوال کیا:

"سید جمال الدین ہم لوگوں کیلئے آپ کو چھوڑ گئے تھے، آپ نے اُن کے بعد اصلاح کا علم بلند رکھا، مجھے خطرہ ہے کہ کہیں آپ کے بعد یہ سلسلہ ٹوٹ نہ جائے، فرمایئے آپ کے بعد کوئی ہے؟ جس سے اصلاح و تجدید کی امیدیں وابستہ کی جا سکیں"۔

استاذ امام نے فرمایا:-

"ہاں، میرے پاس ایک شامی نوجوان ہے جو میرے بعد کام کو سنبھال لے گا، میں اُسے آپ کی خدمت میں تعارف کیلئے بھیجوں گا"۔

اُستاذ نے شاگرد سے خود اس گفتگو کا تذکرہ کیا، اور سید رشید محمود سامی بارودی سے ملے، اور اتنے تعلقات بڑھے کہ بارودی بھی اس شامی نوجوان کے قدرشناس بلکہ ایک اعتبار سے عقیدتمندوں میں شامل ہو گئے، محمود سامی بارودی کو اپنے تمام فضل و کمال اور منصب و جاہ کے باوجود "المنار"

سے عشق تھا، اشاعت سے پیشتر جس ترتیب سے اجزا طبع ہوتے جاتے ان کے پاس بھیج دیئے جاتے۔

(ص ۱۰۷)

اس تفصیل سے مقصود یہ دکھانا ہے، کہ بارہ سال کی رفاقت میں شاگرد و استاذ ایک ہو چکے تھے، اسلئے کوئی تعجب نہیں، اگر امام سید رشید رضا جیسے مخلص اور راست باز انسان نے استاذ امام کی مدح و توصیف کے پیچھے اپنے کو گم کرنے کی کوشش کی ہو، جس کی سیکڑوں مثالیں ان کی تالیفات اور خصوصاً "المنار" میں ملتی ہیں، لیکن جو اپنے کو سچائی سے مٹانا چاہتا ہے، قدرت اسے زندۂ جاوید بناتی ہے اُسے بقائے دوام کے خلعت سے سرفراز کیا جاتا ہے، صاحب سیرت بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں رہے۔

سید رشید اور امیر شکیب ارسلان صاحب سیرت اور سوانح نگار دونوں کا طریقۂ فکر تقریباً متحد ہے، سید جمال الدین سے عقیدت اور شیخ محمد عبدہ کی شاگردی میں بھی دونوں شریک ہیں، فرق اتنا ہے کہ صاحب سیرت کی نشو و نما ایک دیندار اور ذی علم خاندان اور تعلیم و تربیت خالص مذہبی ماحول میں ہوئی، اور دین ہی کی خدمت میں انہوں نے اپنی زندگی گذار دی، ادب و شاعری یا سیاسی زعامت ان کے لئے ضمنی چیزیں اور مذہبی اصلاح کے لوازم کی حیثیت رکھتی تھیں، اس کے برعکس امیر شکیب ارسلان ایک ذی ثروت اور دنیاوی حیثیت سے بارسوخ خاندان کے چشم و چراغ ہیں، ان کا خاندان صدیوں سے سیف و قلم کا مالک رہا ہے، خود امیر شکیب طرابلس کے جہاد میں بنفس نفیس شریک رہے ہیں، ان کے چھوٹے بھائی امیر عادل ارسلان جو آج کل آستانہ میں شامی سفیر کی حیثیت سے مقیم ہیں، ۱۹۲۶ء کے دروزی جہاد میں مجاہدین کی قیادت کر چکے ہیں، ان کے بڑے بھائی امیر نسیب ارسلان مرحوم، مشہور شاعر اور سیاسی لیڈر تھے، اسی خاندان کے ایک رکن امیر مجید ارسلان، جنگ عظیم سے پہلے ممالک متحدہ امریکہ میں عثمانی سفیر رہ چکے تھے، مختصر یہ کہ امیر شکیب "امراء" (نوابوں) کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، ان کا مطمح نظر سید رشید مرحوم کی طرح خالص

"دبی" ہونا دشوار تھا، اپنے خاندانی رسوخ کے باعث وہ عثمانی حکومت سے بہت قریب تھے، ان کے آباؤ اجداد عرصہ تک حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر سرفراز رہے تھے ۱۹۰۸ء کے انقلاب کے بعد وہ خود پارلیمنٹ (مجلس مبعوثان) میں برابر شام کے نمایندہ منتخب ہوتے رہے، انجمن اتحاد و ترقی کے ارکان، وزراء، اور دوسرے ترکی امراء سے ان کے گہرے تعلقات تھے، امیر شکیب خالص عرب ہیں، منذر بن ماء السماء شاہ حیرہ سے ان کا سلسلۂ نسب ملتا ہے، حضرت عمر فاروقؓ کے مبارک عہد میں ان کے جد امجد حلقۂ اسلام میں داخل ہوئے، لیکن آستانۂ خلافت سے خاندانی وابستگی کی وجہ سے ترکوں کے متعلق ان کے جذبات دوسرے عرب رہنماؤں سے مختلف ہیں، امیر شکیب کو ترکوں سے محبت ہے، آلِ عثمان سے عشق ہے، یہی وہ مقام ہے، جہاں امیر البیان اور امام مرحوم ایک دوسرے سے الگ ہوتے ہیں، ترکوں اور آلِ عثمان کے علاوہ دوسرے مسائل میں امیر البیان اور سید رشید اکثر متفق الرائے رہے، اور اگر کبھی معمولی اختلاف رائے بھی ہوا، تو کشیدگی اور بدگمانی کی نوبت نہیں آئی،

امیر البیان اور صاحب سیرت کے تعلقات کی ابتدا کس طرح ہوئی، یہ دلچسپ کہانی خود امیر البیان کی زبانی سنی جائے تو بہتر ہے:-

"جہاں تک یاد پڑتا ہے، کوئی ۱۳۱۳ھ ۱۸۹۵ء کا ذکر ہے، مجھے بیروت میں معلوم ہوا، کہ ایک نوجوان طرابلسی ادیب میری تلاش میں ہے، لیکن پتہ نہ چل سکا، کچھ دنوں کے بعد وہ پھر میری جستجو میں پہنچے میں (کوکب الشرق) ہوٹل میں مقیم تھا، ایک متین و شریف نوجوان سے مل کر بڑی مسرت ہوئی......وہ میرے دیوان "الباکورۃ الجنیۃ"[1] کی بہت تعریف کرتے رہے، دیوان کے اکثر اشعار ان کی زبان پر تھے،

[1] امیر البیان نے یہ دیوان ۱۸۸۶ء ستر ہ سال کی عمر میں طبع کرایا تھا، دو تین سال ہوئے کہ اس کا دوسرا ایڈیشن نئے قصائد کے اضافہ کے ساتھ شائع ہوا، تو عجیب اتفاق کہ خود امام سید رشید رضا (باقی صفحہ ۴۱۹ پر)

لیکن دیوان سے زیادہ سید جمال الدین افغانی اور شیخ محمد عبدہ سے میرے[1] تعلقات کی کشش انھیں کھینچ لائی تھی، وہ میری زبان سے دونوں اماموں کی باتیں سننا چاہتے تھے، جب میں ان کا ذکر کرتا تو نوجوان کی باچھیں کھل جاتیں، اور چہرہ فرطِ مسرت سے پرنور ہو جاتا،......

مجھے معلوم ہوا کہ ان کا نام "محمد رشید رضا" ہے، اور وہ قلمون (طرابلس الشام) کے ایک علمی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں،

پھر دوسری ملاقات ہوئی، تیسری ملاقات اس وقت ہوئی، جب وہ ۱۳۱۵ھ میں مصر کے ارادہ سے رختِ سفر باندھ رہے تھے، میں اتفاق سے اس وقت بھی (کوکب الشرق) ہوٹل میں مقیم تھا، میرے مخلص ترین دوست سید شرتونی، مؤلف (اقرب الموارد) کے ساتھ وہ بھی کھانے پر مدعو تھے، تین چار گھنٹے پرلطف صحبت رہی، سیاحتِ لبنان سے متعلق میری ایک تحریر "الاہرام" میں چھپی تھی، دونوں کو پڑھکر سنایا،......

شرتونی کے جانے کے بعد سید رشید نے مصر کے سفر کا راز بتایا، اور اخفا کا وعدہ لیا کیونکہ ممکن تھا، حکام کو اسکی خبر ہو جاتی، تو سفر دشوار ہو جاتا، یہ سلطان عبدالحمید کا زمانہ تھا، سفر کی اجازت مشکل سے ملتی تھی، میں خود پیرس کی نمائش (۱۹۰۰ء) میں جانا چاہتا تھا، لیکن اجازت نہ مل سکی (ص ۴۵، ۱۲۴) امام سید رشید مصر تشریف لے گئے، المنار کا اجراء ہوا، اور ان کے علم و عرفان کی روشنی دور و نزدیک پھیلتی رہی، اس دوران میں امیر سے خط و کتابت جاری رہی، لیکن ۱۹۰۸ء سے پہلے پھر ملاقات کا موقع نہ مل سکا،

(بقیہ حاشیہ ص ۴۱۸) اس نئے اڈیشن کی طباعت کا اہتمام کر رہے تھے، اور ابھی چھپائی جاری تھی، کہ ان کی زندگی کا چراغ گل ہو گیا، [1] حکیم مشرق سید جمال الدین سے امیر البیان کو "تعارف" حاصل تھا، حاضر العالم الاسلامی میں امیر نے سید جمال الدین سے اپنی ملاقات اور ان کے ارشادات کا مفصل تذکرہ کیا ہے،

۱۹۰۸ء کے انقلاب کے بعد سید رشید وطن مالوف کی زیارت کو گئے، انجمن اتحاد و ترقی بیروت کے دفتر میں دیر تک صحبت رہی، بار ہا عم محترم امیر مصطفیٰ ارسلان کے گھر پر وہ تشریف لائے، اور مختلف مسئلوں پر جی کھول کر باتیں ہوئیں،

اس سلسلہ میں انھوں نے جامع اموی دمشق میں لکچر بھی دئے، جس پر بڑا ہنگامہ ہوا، لوگوں کو ان کے درس میں "توہب" کی بو معلوم ہوئی، شیخ صالح تونسی نے بڑا ہنگامہ کیا، اور عوام کو سید رشید کے خلاف ابھارنے کی کوشش کی، آخر حکومت کی دخل اندازی سے یہ فتنہ فرو ہوا" (ص ۱۴۷)

پھر سننے میں آیا کہ وہ مدرسہ (دعوت وارشاد) کے لئے حصول اعانت کے سلسلہ میں آستانہ تشریف لے گئے ہیں، ارکین انجمن اتحاد و ترقی نے شروع میں تو بڑے وعدے کئے، لیکن پھر ٹالنا چاہا، بیچارے سال بھر آستانہ میں مقیم رہے، آخر میں مایوس ہو کر مصر واپس چلے آئے، انھیں یقین ہو گیا تھا، کہ انجمن اتحاد و ترقی سے عربوں کی کوئی بھلائی نہیں ہو سکتی اسلئے برابر اسکی پالیسی پر نکتہ چینی کرتے رہے، (ص ۱۴۸)

۱۹۱۱ء میں طرابلس کے سفر کے سلسلہ میں مصر سے گذرنا ہوا، اس میں سید رشید سے خوب ملاقاتیں رہیں، شیخ محمد عبدہ کے زمانہ میں خدیو مصر سید رشید سے خوش نہ تھے، لیکن استاذ امام کی رحلت کے بعد بارگاہ خدیویت میں سید رشید پھر بار پانے لگے، خدیو نے مجھے طرابلس کے ارادہ سے روکنے کی کوشش کی، لیکن میں جہاد کی نیت کر چکا تھا،

عین منصورہ (طرابلس الغرب) کی چھاؤنی میں شیخ صالح تونسی[1] مرحوم سے خوب ملاقاتیں رہیں، وہ سید رشید کے دینی خیالات سے سخت اختلاف رکھتے تھے، میں نے ان کی شدت میں کمی کرنے کی کوشش کی، لیکن انہیں شیخ محمد عبدہ اور سید رشید سے بدگمانی پر اصرار تھا،

[1] شیخ صالح تونسی عبدالعزیز شاویش، علی یوسف پاشا ایک خیال کے بزرگ اور اتحاد اسلامی کے سرگرم کارکن تھے، دولت عثمانیہ میں انور پاشا مرحوم سے اس جماعت کے تعلقات بہت خوشگوار اور دوستانہ تھے، اب اس گروہ کے "باقیات صالحات" میں بوڑھے امیر شکیب اور جوان عبدالحمید سعید کا نام لیا جا سکتا ہے،

سید رشید سے شیخ صالح کو اتنی نفرت تھی، کہ ایک مرتبہ انھوں نے مجھے المنار پڑھتے دیکھا، تو ان کے غیظ و غضب کی کوئی انتہا نہ رہی، کہنے لگے "اس میں گمراہیوں کا انبار ہے، اور بسا اوقات کفریہ باتیں بھی ہوتی ہیں"، معاذ اللہ!

پہلے ذکر آچکا ہے، کہ ترکوں کے مسئلہ میں امیر البیان اور سید رشید کے خیالات یکساں نہ تھے یہ اختلاف یوں تو ابتدا سے تھا، لیکن عثمانی انقلاب (۱۹۰۸ء) کے بعد عربوں کا قومی جذبہ جوں جوں روز افزوں ترقی کرتا گیا، عربوں اور ترکوں کے ہمدردوں کے درمیان اختلاف کی خلیج وسیع ہوتی گئی، جہاد طرابلس کے سلسلہ میں یہ دونوں عنصر عارضی طور پر متحد ہو رہے تھے، کہ جنگ بلقان کے شرارے بلند ہوئے، اور جنگ عظیم کے علامات نمودار ہونا شروع ہو گئے، عربوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہا، عرب قائدین اندرونی مکمل آزادی کا مطالبہ کر رہے تھے، اور ارکین اتحاد و ترقی وعدوں پر ٹالنا چاہتے تھے، اس کشمکش میں سید رشید رضا مرحوم طبعی طور پر عرب رہنماؤں کی پہلی صف میں تھے، اور امیر شکیب ارسلان عربوں کے مطالبات سے کامل اتفاق کے باوجود اس برے وقت ترکوں کا ساتھ نہیں چھوڑنا چاہتے تھے،

اگر یہ اختلاف رائے اوسط درجہ کے دو آدمیوں میں ہوتا، تو شاید زیادہ اہمیت نہ ہوتی لیکن امیر البیان اور سید رشید کا باہمی اختلاف، چوٹی کے دو عرب لیڈروں کا اختلاف تھا، اسلئے اسے بہت اہمیت دی گئی، مخالفین نے خوب آوازے کسے، اور آخر کار تعلقات میں کشیدگی پیدا ہو گئی جو تقریباً ۹ سال باقی رہی، اس کشاکش کی پر لطف داستان امیر البیان نے خوب مزے لے کر بیان کی ہے، مفصل نہیں تو مجمل طور پر یہی داستان سننے کے لائق ہے، ؎

"جنگ بلقان کے شرارے بلند ہوئے، تو ہم لوگوں کو خطرہ دامنگیر ہوا، کہ کہیں حکومت طرابلس کی امداد میں کوتاہی سے کام نہ لے، ناچار مجھے برقہ چھوڑ کر آستانہ کا قصد کرنا پڑا، انجمن ہلال احمر مصر نے مجھکو اپنے وفد مقیم آستانہ کا نگران بھی مقرر کر دیا تھا، پھر خدیو کے اصرار پر آستانہ سے مصر واپس آیا، سید رشید کی معیت میں خدیو سے ملاقات ہوئی، خدیو کی خواہش تھی، کہ میں مصر ہی میں رہوں، تاکہ وقت پر شیخ علی یوسف اور سید رشید کے ساتھ وہ میری خدمات سے بھی فائدہ اٹھا سکیں، لیکن میں اس خطرناک حالت میں اتحادیوں (ارکین اتحاد و ترقی) کی مخالفت پسند نہیں کرتا تھا، اور اسی بنا پر سرای عابدین (قصر شاہی) ہی میں مجھ سے اور فرید پاشا وزیر اعظم سے ایک جھڑپ بھی ہوگئی تھی، یہ لوگ جنگ بلقان کے دوران میں اتحادیوں پر حملہ کی تجویز کر رہے تھے، اور میں اندرونی اختلافات میں حد سے گذرنا نہیں چاہتا تھا خصوصاً جب کہ بلقانی فوجیں دارالخلافہ کے دروازہ پر عثمانی حکومت کے شکست و ریخت کا خواب دیکھ رہی ہوں ......

خدیو کو اس جنگ و جدال کی خبر ملی، تو وہ بھی برافروختہ ہوگئے، لیکن میں نے اس کی پرواہ نہیں کی حق کے مقابلہ میں، میں کبھی کسی سے نہیں دبا،

اس وقت سید رشید بھی اتحادیوں کے دشمن تھے، المنار میں ان کی برائیوں اور فردگذاشتوں پر سلسلہ وار مضامین شائع ہو رہے تھے، مجھے اس کا علم تھا، اور میں نے کبھی انھیں ان کی سوچی بھی ہوئی راہ سے ہٹانے کی کوشش نہیں کی، میری طرح انھیں بھی اپنے سیاسی مشرب کی سچائی کا پورا یقین تھا، اختلاف رائے کے باوجود تعلقات خوشگوار تھے، کم از کم کشیدگی نہیں پیدا ہوئی تھی،

لیکن جنگ بلقان ہی کے دوران میں افواہ گرم ہوئی کہ حکومت اپنی عزت و خودداری کے تحفظ کی خاطر لندن سے قرض لینا چاہتی ہے، حکومت کے مخالف بعض شامی لیڈروں نے

تار بازی شروع کردی، اس طریقہ سے وہ قرضہ کے حصول میں رکاوٹ پیدا کرنا چاہتے تھے، مجھے اس روش سے انتہائی تکلیف ہوئی، میں نے عربوں سے سوال کیا کہ وہ کیا چاہتے ہیں؟ اگر اتحادیوں کو قرض دینے کے وہ اسلئے مخالف ہیں، کہ مالی پریشانی کے باعث فوج کو رسد نہیں مل سکے گی، تو انھیں معلوم ہونا چاہئے، کہ عثمانی فوج میں ترکوں کی طرح ہزاروں عرب بھی ہیں، اگر انھیں ترکوں اور خلافت کے علمبرداروں پر رحم نہیں آیا، تو کم از کم اپنے بھائیوں پر تو ترس کھانا چاہئے تھا،

میں نے یہ سوال "الشعب" مصر میں پہلے گمنام شائع کرایا، کہ دیکھیں کیا جواب ملتا ہے، آخر اس جماعت کے سرگروہ رفیق العظم[۵۱] کی طرف سے جواب شائع ہوا، اس جواب میں نہ صرف خبر کی تردید تھی، بلکہ سوال کرنے والے پر خوشامد اور ترکوں کی جا و بیجا محبت کا الزام بھی لگایا گیا تھا، اس پر میں نے اپنے نام سے دوبارہ لکھا، اور اپنے دوست رفیق العظم کو جن کے ساتھ میں اور سید رشید برابر رازدارانہ مشورے کیا کرتے تھے، جواب دیا کہ میں کسی کی خوشامد نہیں کرتا، زمانہ بتلا دیگا کون جا و بیجا خوشامد کرتا ہے، اور کون غیرملکی طاقت کا ہاتھ مضبوط کر رہا ہے،

اس پر یہ جماعت بہت برہم ہوئی، اور مجھے اپنا دشمن خیال کرنے لگی، اسلئے کہ یہ لوگ انگریزوں کی مدد سے عربی حکومت قائم کرنا چاہتے تھے، صاحب سیرت بھی اسی جماعت سے تعلق رکھتے تھے، لیکن وہ انگریزوں کی محبت میں اندھے نہیں تھے، اور ہر حال میں ان کی اطاعت اور رہنمائی میں چلنا بھی پسند نہیں کرتے تھے، اس حادثہ کے بعد ان سے ملتا رہا، لیکن ایک دوسرے کے مقابل آجانے کی وجہ سے محبت کی بنیادیں متزلزل ہو رہی تھیں،

---

۵۱ آل العظم، دمشق کا مشہور ذی علم اور ذی وجاہت خاندان ہے، اس خاندان کے متعدد افراد عثمانی حکومت میں اعلی عہدوں پر متمکن رہے ہیں، رفیق العظم مشہور عربی مفکر اور اہل قلم تھے، متعدد تصنیفات انکی یادگار ہیں جن میں زیادہ مشہور اشہر مشاہیر الاسلام فی الحروب السیاسۃ کے چار حصے ہیں، ۱۳۴۳ھ میں وفات پائی،

عجیب اتفاق کہ فرید پاشا سے جس روز قصر شاہی میں جھگڑا ہوا، اسی دن المؤید کے دفتر میں شیخ علی یوسف سید رشید رضا، عبدالحمید زہراوی[1]، اور حنفی بک ناجی سے ملاقات ہوئی باتیں ہو رہی تھیں، کہ دفتر میں ایک اہم برقی پیغام موصول ہوا، خبر کا خلاصہ یہ تھا، کہ جرمنی نے تین ارب کی رقم مصارفِ جنگ کے لئے مخصوص کر دی ہے، اس پر شیخ علی یوسف بولے:۔

"مجھے جنگ کے علامات نظر آتے ہیں"، اس سلسلہ میں مسئلہ چھڑ گیا، کہ جنگ میں حکومت کو کس فریق کا ساتھ دینا چاہئے، میں نے کہا "اکثر دشمن اسلام حکومتیں اس وقت جرمنی کے مقابل صف میں نظر آتی ہیں"، زہراوی نے کہا "تو گویا مطلب یہ ہے، کہ ہم جرمنی کی غلامی قبول کر لیں" مجھے اس جملہ سے بہت اذیت پہونچی، زہراوی کی نیت تعریض کی تھی، میں بھی بول اٹھا "نہیں بلکہ انگریزوں کی"..... اس پر بات بڑھ گئی، تا آنکہ زہراوی نے کہا:۔

"حکومت، حکومت کیا کہتے ہو، اب حکومت کہیں ہے بھی؟ عثمانی حکومت کا دیوالہ نکل چکا" میں نے کہا "نہیں ابھی حکومت باقی ہے، انگریز بھی اسے سمجھتے ہیں، لیکن تم لوگ اس کے خاتمہ کی خیر منا رہے ہو، اور اپنوں کو دوسروں کے سامنے بدنام کرنے کی کوشش کرتے ہو ہمارے پاس کوئی دو چار حکومتیں تو ہیں نہیں، اگر یہ گئی تو پھر کس کا نام لیں گے"؟

اگر ہم نہ کہیں تو کیا غیروں پر حکومت کی کمزوری چھپی ہوئی ہے"؟ اس پر سید رشید کو بھی بہت طیش آیا، وہ مجھ سے مخاطب ہو کر نہایت غصہ میں کہنے لگے، "تم ہمیشہ ہم لوگوں کو بدنام کرتے ہو کہ ہم حکومت کے مٹنے کی تمنا رکھتے ہیں، اور ہم پر بہتان باندھتے ہو"،

ابھی وہ جملہ ختم بھی نہ کرنے پائے تھے، کہ میں فرطِ غضب میں بول اٹھا "غلط، تم بہتان باندھتے ہو"

[1] عبدالحمید زہراوی کو عربی تحریک کا امام سمجھا جاتا ہے، اتحادیوں نے انھیں پھسلا کر آستانہ بلایا، اور وہیں انھیں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا، امیر شکیب ارسلان کی طرح یہ بھی مجلس مبعوثان کے ممبر تھے،

اتنے میں شیخ علی یوسف اور حنفی ناجی درمیان میں حائل ہو گئے، اور دونوں کو ٹھنڈا کیا، یہ پہلا موقع تھا جب صاحب سیرت اور میرے درمیان اختلاف رونما ہوا،....... اور اس واقعہ کے بعد پھر تقریباً نو سال تک ہم دونوں ایک دوسرے سے الگ رہے، بایں ہمہ مجھے سید رشید کے اخلاص اور سچائی پر پورا اعتماد تھا، ترکوں سے نفرت کے باوجود وہ انگریزوں کے مقابلہ میں انھیں ترجیح دیتے تھے"

(ص ۱۵۱-۱۵۴)

یہ تھی اجمالی سرگذشت اس اختلاف کی جس نے دو دوستوں کو نو سال تک ایک دوسرے سے الگ رکھا، یہ شور و شر اور ہنگامہ و فساد کا زمانہ تھا، جنگ عظیم کے باعث سید رشید دوسرے عرب رہنماؤں کے ساتھ اپنی کارروائیوں میں منہمک تھے، دوسری جانب امیر شکیب آستانہ اطرابلس اور برلین کا چکر لگا رہے تھے،

لیکن اس قطعِ تعلق کے باوجود دونوں کے دل ایک دوسرے سے قریب تھے، خط و کتابت کا کیا ذکر اس پر آشوب دور میں خفیہ پیام رسانی بھی دشوار تھی، بہر حال امیر البیان سید رشید کی خیریت ہر وارد و صادر سے دریافت کیا کرتے،

یہ دن بھی گذر گئے، جنگ کی ظلمت کافور ہوئی، شام پر فرانسیسیوں کے قبضہ کے ساتھ عرب رہنماؤں کو اپنی غلطی کا احساس ہوا، امیر فیصل یوسف بے کارواں کی طرح یورپ میں مارے مارے پھرتے تھے، لیکن کوئی پرسانِ حال نہیں تھا، اس وقت عرب لیڈروں کو امیر شکیب ارسلان کی نصیحت یاد آئی، غداری اور خیانت کا الزام لگانے والے پھر تجدید بیعت کرنے لگے اب انھیں معلوم ہوا کہ

سیعلمُ قومی انّنی لا أغشهُم[1] — وهمّا استطال الليل فاصبح واصله

(میری قوم عنقریب جان لے گی، کہ میں ان سے خیانت نہیں کر رہا ہوں)

[1] یہ امیر البیان کی ایک نظم کا مشہور شعر ہے، جس نے اب عربی سیاسیات میں تاریخی حیثیت حاصل کر لی ہے

(شک وشبہ کی بھیانک رات کتنی ہی لمبی ہو (سچائی) کی صبح بہر حال نمودار ہو کر رہے گی)

اب انھیں معلوم ہوا کہ "سیعلم" الخ کا کہنے والا ٹھیک کہتا تھا، دوستوں نے پھر رہنمائی کی درخواست کی، سید رشید کے دل میں بھی پرانے رفیق کی یاد تازہ ہوئی، "پیام وسلام" سے عہد الفت کی تجدید کی گئی، مرحوم نے پوری سادگی اور صفائی سے اپنے دوست کو لکھا،:۔

"جو ہوا سو ہوا، آئیے اب ہم لوگ سب مل کر صورت حال کی اصلاح کی کوشش کریں" (ص ۱۶۰)

تعلقات استوار ہو گئے، جنیوا میں شامی کانفرنس منعقد ہوئی، (۱۹۲۱ء) امیر شکیب نے اثنائے جنگ میں "شام کے حوادث" کے عنوان سے ایک سلسلۂ مضامین شروع کیا، جو "المنار" اور تمام مشہور اخبارات میں شائع ہوا، سید رشید نے اس پر ایک طویل شذرہ بھی لکھا تھا، جس کا ذکر اوپر آچکا، خط وکتابت کا سلسلہ بھی برابر جاری رہا،

اس دوران میں ملاقات کے صرف دو موقع میسر آئے، امیر البیان حج کے ارادہ سے ۱۳۴۸ھ میں جب سویز سے گذرے، تو بچھڑے ہوئے دوست ایک دوسرے سے گلے ملے، پورٹ سعید سے سویز تک ساتھ رہا، واپسی میں امیر البیان کی والدہ محترمہ اور ابن عم امیر امین ارسلان کے ساتھ سید رشید بھی پورٹ سعید تشریف لائے، اور برابر ساتھ رہے، اور تین چار روز تک پرلطف صحبت رہی، (ص ۱۶۳)

(بقیہ حاشیہ ص ۴۲۵) آستانہ کی عربی انجمن (المنتدی العربی) نے دوران جنگ میں صلاح الدین نامی ایک ڈرامہ کی تمثیل کی تھی، امیر البیان نے اسی سلسلہ میں یہ نظم سلطان صلاح الدین پر لکھی، اور خود تمثیل کے اثنا میں پڑھی تھی، نظم کے آخری چھ سات شعر اس وقت کی سیاسیات سے متعلق تھے، "سیعلم قومی" الخ آخری شعر ہے، باذاق حلقوں میں صرف "سیعلم قومی" کہدینا امیر شکیب کی سیاسی پالیسی کی شرح وتفصیل کے مرادف ہے،

دوسری ملاقات ۱۳۵۳ھ میں وفات سے تقریباً سال بھر پہلے ہوئی، لیکن اسے ملاقات کہنا بھی ظلم ہوگا، اس کا واقعہ یہ ہے کہ سلطان ابن سعود اور امام یحییٰ کے باہمی اختلافات طے کرانے کی غرض سے اکابر اسلام کا ایک وفد مرتب ہوا، وفد کی تشکیل میں فلسطین کے محبوب رہنما، اور امام سید رشید رضا کے شاگرد رشید سید امین حسینی کی کوششوں کا بہت دخل تھا، وفد کے ایک رکن[1] امیر شکیب بھی تھے، جنیوا سے ہوا کے بازو پر اسکندریہ پہنچے، یہاں مصر کے اکابر کا اجتماع تھا، لیکن پولیس کا پہرہ سب پر غالب تھا، ریل سے پورٹ سعید روانہ ہوئے، پولیس کے جوان ہمرکاب تھے، سید رشید فرط محبت سے ضبط نہ کر سکے، درمیان میں کسی اسٹیشن پر ہمت کرکے ڈبہ میں آگئے، پولیس کی نگرانی سخت تھی، اس سے اور "الشباب" کے مجاہد اڈیٹر محمد علی الطاہر سے نوک جھونک ہو چکی تھی، امیر شکیب سے بھی نہ رہا گیا، چنانچہ انتہائی ممانعت کے باوجود انھوں نے بڑھکر مصافحہ کیا، اور پولیس افسر سے کہا "تمھارا جو جی چاہے، کر لو" پھر سید رشید دوسرے ڈبہ میں چلے گئے، یہ آخری ملاقات تھی، اور آخری مصافحہ!! صلح کی مہم پر جنیوا سے ایک اسلام کا سپاہی آتا ہے، وہ اسکندریہ کے ساحل پر اپنے بھائی سے دو باتیں بھی نہیں کر سکتا، دو دوست آمنے سامنے تھے، اور دونوں کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز! اللہ جانے، آنکھیں دو دوستوں کی محرومی پر گریاں تھیں، یا مسلمانوں کے اس بُرے دن پر، ؟ زبانیں خاموش تھیں، لیکن امت کے دو دردمند آنکھوں ہی آنکھوں میں ہم کلامی کر رہے تھے، امام مرحوم میں جرأت زیادہ تھی، اور امیر کی طرح ضابط بھی نہیں تھے، ان کی زبان سے بے اختیار نکلا، "لا عجب (کچھ تعجب نہیں)،

"وھذہ آخر کلمۃ سمعتھا من فیہ قدس اللہ روحہ (ص ۵ - ۱۶۴)

میں نے ان کی زبان سے یہ آخری کلمہ سنا تھا،

[1] وفد کے کل چار رکن تھے، سید امین حسینی (صدر) ہاشم اتاسی (شام)، محمد علی علوبہ (مصر) اور امیر شکیب (جنیوا) یہ تمام

سید رشید مرحوم کی تمنا تھی، کہ امیر البیان مصر کو اپنا مسکن بنائیں، اس کے لئے کوششیں بھی ہوئیں، لیکن اجازت نہ مل سکی، پھر بھی کچھ کچھ توقع باقی تھی، کہ ع

آن قدح بشکست وآن ساقی نہ ماند

مکتوبات رشیدیہ یہ خطوط دو دوستوں کے ذاتی تعلقات کا آئینہ اور لکھنے والے کی سچائی، اور خلوص کی بولتی ہوئی تصویریں ہیں، کوئی دن نہیں جاتا، کہ مکتوب نگار، مکتوب الیہ کے صاحبزادے امیر غالب کی خیریت نہیں دریافت کرتے، ان کی تعلیم و تربیت کے متعلق سوالات کرتے، مشورے دیتے، اور بلندی اقبال و دولت (دولت دینی و دنیادی) کی دعائیں دیتے،

فرانسیسی زبان میں امیر شکیب ایک ماہانہ رسالہ (La Nation Arabe) جنیوا سے نکالتے ہیں، عام طور پر وہ یورپ کے مشہور ارباب سیاست اور بارسوخ لیڈروں کو مفت بھیجا جاتا ہے، اسلئے قدرتی طور پر امیر کو اپنے جیب خاص سے بہت کافی صرف کرنا پڑتا ہے، کبھی کبھی یہ خسارہ ناقابل برداشت حد تک پہنچ جاتا ہے، کہیں ایک مرتبہ مکتوب نگار کو امیر کے مالی نقصانات کی اطلاع مل گئی، انہوں نے لکھا،

"...... اس طرح مجھے آپ کے فرنچ رسالہ کے مصارف سے سخت اختلاف ہے، آپ جس قوم اور جس ملک کے لئے اتنا کر رہے ہیں، اسے اس کا احساس بھی نہیں، اسلئے قطعاً وہ ان قربانیوں کی مستحق نہیں، ان مصارف کا بار اٹھائے بغیر بھی اس سے زیادہ مفید خدمتیں انجام پا سکتی ہیں،" (ص ۵۰۰)

امیر شکیب پر مراسلات کا بڑا بار ہے، دنیائے اسلام کے ہر خطہ سے سینکڑوں خطوط

(بقیہ حاشیہ ص ۴۲۷) تفصیل امیر البیان نے اپنے ایک دوسرے مقالہ میں بھی کی ہے جو مرحوم کی وفات پر انجاد میں شائع ہوا تھا، مجموعہ میں وہ بھی شامل ہے، (ص ۲۷۲)

آتے ہیں، اور وہ اپنی جیب سے سب کا جواب دیا کرتے ہیں، راقم الحروف کا ذاتی تجربہ ہے کہ بسا اوقات وہ رجسٹری اور ہوائی ڈاک سے عنایت نامے بھیجا کرتے ہیں، عربی کے تمام مشہور اخبارات دو تین سال پیشتر تک ان کے مضامین سے بلا معاوضہ سرفراز ہوتے تھے، ۱۹۲۹ء میں امیر کی ڈاک کا تخمینہ یہ تھا،

سترہ اٹھارہ سو کے لگ بھگ خطوط، اور اخبارات کے لئے ڈھائی سو چھوٹے بڑے مضمون تصنیف و تالیف کی محنت الگ، (ص ۵۲۰۶، حاشیہ)

مکتوب نگار کو اپنے دوست کی ان پریشانیوں سے بہت تکلیف ہوتی تھی، بار بار صحت اور مال کی بے سود قربانیوں سے منع کرتے، اپنی اور مسلمانوں کی بھلائی کے نام پر ان سے آرام کی درخواست کرتے، (ص ۵۲۶)

مکتوبات پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے اندازہ ہو جاتا ہے، کہ مکتوب نگار بہت بامروت اور محبت کے آدمی تھے، محمد علی الطاہر کا یہ کہنا بالکل صحیح ہے، کہ "امام سید رشید رضا میں کمال عقل اور وسعت تجربہ کے باوجود بڑوں کا لڑکپن بھی تھا" امیر غالب کو ایسے لطیف پیرایوں میں محبت و پیار کے پیام بھیجتے ہیں، کہ حیرت ہوتی ہے،

لیکن اس سادگی اور پاکیزگی قلب کے ساتھ وہ قومی اور مذہبی معاملات میں بہت سخت گیر تھے، قومی و مذہبی معاملات تو خیر بڑی چیز ہیں، ادب و انشاء میں بھی ان کی نگاہ بہت نکتہ چین اور سخت گیر واقع ہوئی تھی، امیر نے اپنی عہد شباب کی ایک تالیف (آخر بنی سراج) دوبارہ طباعت کے لئے المنار پریس میں بھیجی، نظر ثانی اور پروف کی تصحیح خود صاحب المنار کر رہے تھے، امیر کی ابتدائی تصنیف تھی، زبان و ادب کی لغزشیں نظر پڑیں، ان غلطیوں پر ایک خط کیا اچھا خاصہ رسالہ[1]

[1] امیر کے جوابی حاشیوں کو ملا کر یہ ایک خط مستقل صفحوں پر پھیلا ہوا ہے، (ص ۴۸۳-۵۰۶)

تصنیف کرکے امیر کے پاس بھیج دیا، وہ لغزشیں غلطیوں کے حکم میں نہیں تھیں، لیکن امیر البیان کی ادبی حیثیت سے ضرور گری ہوئی تھیں، ان "لغزشوں" کے سلسلہ میں دونوں میں خوب رسّہ کشی رہی، یہ غلطیاں دراصل دوسری زبانوں کے اثرات سے عربی میں داخل ہوگئی ہیں، (آخری سراج) امیر کی ابتدائی تالیف تھی، اس لئے عام روش کے مطابق یہ بھی نامانوس ترکیبوں سے نہیں بچ سکی بعض مفردات کی مسامحت بھی تھی، مثال کے طور پر بعض نمونے دیئے جاتے ہیں،

"الخطر المحیق" "محیق" مزید سے نہیں سنا گیا، فصیح مجرد سے آتا ہے، قرآن مجید میں (وحاق بھم ما کانوا الایۃ) اس معنی میں اور اسی مادہ سے آیا ہے، (ولا یحیق المکر السیئ) بھی مجرد ہی سے استعمال ہوا ہے، (ص ۴۰۶)

"ضجۃ مھولۃ" مھولۃ بھی مزید سے نہیں آتا، (ھالہ الامر) صحیح اور فصیح استعمال ہے، یہ امام سید رشید رضا کی گرفت ہے، امیر البیان حاشیہ میں اس کی صحت پر جاہلی شعر پیش کرتے ہیں: ۔

ومھول من المناھل وحش ۔۔۔ ذی عرانین آجن مدفان

اب مھول کے معنی (مکان فیہ ھول) کے ہوں گے،

جدید ترکیبوں[1] کے متعلق مکتوب الیہ اور مکتوب نگار کے درمیان کچھ اصولی اختلافات بھی تھے، راسخ العقیدہ محافظینِ ادب جدید افرنجی ترکیبوں کے مطلق روادار نہیں، اور معتدل حضرات مانوس اور ذوق کے مطابق ترکیبوں کا داخلہ بند کرنا نہیں چاہتے، امیر البیان اسی معتدل گروہ سے تعلق رکھتے ہیں، اس لئے وہ مکتوب نگار کے اس ادبی مواخذہ سے اتفاق نہ کرسکے، بعض

[1] جدید عربی ترکیبوں اور ان کی صحت و عدم صحت کے متعلق تفصیلی معلومات کے لئے لغات جدیدہ (طبع جدید) کا مقدمہ ملاحظہ کیا جاسکتا ہے،

اعتراضات نحوی ہیں، اصل رسہ کشی انہی کے متعلق ہوئی ہے،

جہاں کہیں امیر کو خود اپنی توجیہ پر اطمینان نہیں ہوا ہے، وہاں اپنے اور امام مرحوم دونوں کے متفقہ استاذ محترم علامہ تقی الدین[1] ہلالی کو حکم بناکر ان پر فیصلہ چھوڑ دیا ہے، مثال سے وضاحت ہوگی،

۱۔ (وما ھو ذلک القصر) دراصل یہ منطقیوں کی اصطلاح سے ماخوذ ہے، اشیاء کی حقیقت کے متعلق جب انھیں سوال کرنا ہوتا ہے، تو وہ (ماھو) سے کام لیتے ہیں، رفتہ رفتہ یہ استعمال ادباء میں رواج پاگیا، حالانکہ نہ ضمیر کی یہاں ضرورت ہے، اور نہ اس کا کوئی مرجع مذکور ہے،

(سید رشید ص ۴۰۸)

امیر شکیب قاعدہ کے اعتبار سے مکتوب نگار کا قول تسلیم کرتے ہیں، لیکن اس ترکیب کی صحت میں انھیں مطلق شک نہیں، سیبویہ کی (الکتاب) اور ابن ہشام کی (مغنی اللبیب) سے متعدد شواہد بھی حاشیہ میں نقل کئے گئے ہیں،

ابن ہشام اور سیبویہ کی عبارتوں کا خلاصہ یہ ہے، کہ ضمیر منفصل کبھی بلا کسی خاص ضرورت کے بھی مستعمل ہوتی ہے، اور نحوی ترکیب میں اس کی مختلف توجیہیں کی جاسکتی ہیں،

(حاشیہ ص ۹-۴۰۸)

علامہ ہلالی نے بھی امیر البیان کی تائید کی ہے، ان کے نزدیک اس ترکیب کے عدم جواز کا فتویٰ کسی طرح نہیں دیا جاسکتا، صرف عدم جواز ہی نہیں، بلکہ ہلالی صاحب (ماھو ذلک القصر)

[1] ہم لوگوں کا عرصہ سے خیال تھا، کہ ہلالی صاحب اسوقت ادبائے عرب کی صف اول میں جگہ پانے کے لائق ہیں، خصوصاً لغت و نحو میں تو مشکل سے دو چار انکی ہمسری کا ادعا کرسکتے ہیں، راقم الحروف آج سے دو سال پیشتر لغات جدیدہ (طبع دوم) کے مقدمہ میں شیخ ہلالی مدظلہ کا شمار درجہ اول کے ادبا میں کرچکا ہے، امیر البیان کی تحکیم سے ناچیز اور حقیر رائے کی بہت تقویت ہوئی،

کو خلاف بلاغت بھی نہیں مانتے، نحوی توجیہ یوں ہو سکتی ہے، ضمیر (ھو) القصر کی طرف لوٹے گی،
"القصر" اگرچہ لفظاً متاخر ہے، لیکن رتبہ میں متقدم ہے، اسلئے کہ "ذلک" مبتدا کا وہ بدل ہوگا،
اور جملہ "ما" کو خبر ہوگا، استفہام کی وجہ سے اسکی تقدیم لازم ہوئی، (ص ۳۹۰)

۲۔ مکتوب نگار کو (نحو ثلاثمائة) پر بھی اعتراض ہے، "نحو" کی براہ راست اضافت کو وہ
اچھا نہیں سمجھتے، فصیح استعمال (نحو من ثلاثمائة) ہے، (ص ۲۹۵)

امیر البیان (نحو ثلاثمائة) کو غلط نہیں سمجھتے لیکن (نحو من ثلاثمائة) کو افصح اور اولیٰ
تسلیم کرتے ہیں، ہلالی صاحب کا فیصلہ بھی سید رشید کی تائید میں ہے لیکن اتنے اضافہ
کے ساتھ:۔

"لیکن سیبویہ سے لے کر آج تک تمام مصنفین اور شعراء اس ترکیب کو بکثرت استعمال
کرتے آئے ہیں، "نحو" کے معنی یہاں "مثل" کے ہیں، اس لئے جواز میں کوئی اشکال نہیں،

(حاشیہ ص ۲۹۵)

امیر نے تمام ادبی اختلافات میں ہلالی صاحب کی رائے کو کافی اہمیت دی ہے، اور
ایک جگہ انھیں (الغایة البعیدة فی النحو واللغة) بھی کہا ہے، لیکن اکثر و بیشتر اختلافات میں
ہلالی صاحب کی رائے مکتوب نگار کی تائید میں ہے، البتہ مختلف فیہ ترکیبوں کی جواز کا فتویٰ دیتے
ہیں، اور نفس جواز سے مکتوب نگار کو بھی انکار نہیں معلوم ہوتا، ہلالی صاحب کے علاوہ
کہیں کہیں مصطفےٰ جواد (بغداد) سے بھی، امیر نے محاکمہ کی خواہش کی ہے، اور یہ خود اپنی جگہ پر امیر البیان
کی فراخ دلی اور انکسار کی دلیل ہے،

مضمون کی طوالت کے خوف سے زیادہ مثالیں نہیں دیجا سکیں، ان لغزشوں کا اصلی
سبب جیسا کہ اوپر ذکر ہوا صرف یہ ہے، کہ (آخر بنی سراج) امیر کے عہد شباب کی تالیف بلکہ

ترجمہ ہے، خود امیر لکھتے ہیں،

"ہم نے (اشاتوبریاں) کی کتاب (آخر بنی سراج) کا ترجمہ آج سے چالیس سال پہلے کیا تھا،
اور ترجمہ میں فریخ اصل سے مطابقت کی کوشش بھی کی تھی، اسلئے اس میں کچھ غلطیاں رہ گئیں،
جن کی تنقید میں سید رشید حق بجانب تھے، ان میں بعض واقعی غلطیاں ہیں، اور بعض کی توجیہ ہو سکتی
ہے، .... اور ہم نے مرحوم کے حسب منشا نئے اڈیشن میں صحت طلب فروگذاشتوں
کی تصحیح کر دی ہے"۔

(ص ۴۴۸ حاشیہ)

مکتوب نگار کی سخت گیری کی ایک اور مثال ملاحظہ ہو، امیر البیان عام طور پر تفصیل اور شرح
و بسط کیساتھ لکھنے کے عادی ہیں، کہیں تفصیل در تفصیل ہوتی چلی جاتی ہے، بعض اوقات ضمنی مسئلوں
میں کچھ موضوع بحث سے دور بھی ہٹ جاتے ہیں، لیکن انداز بیان اس قدر دلچسپ اور لذیذ
ہوتا ہے، کہ عام طور پر گراں نہیں گذرتا، بلکہ اسکی طلب اور بڑھ جاتی ہے، امیر کی تصنیفات اور مضامین
میں اس کے نمونے بہت ملتے ہیں، امیر کی بعض تحریریں بسا اوقات مولانا محمد علی مرحوم کے آخری
ایام کی تحریروں سے ملتی جلتی نظر آتی ہیں، صرف طوالت اور پریشانی میں، انشاء میں امیر کا پایہ
بہت بلند ہے، مکتوب نگار ایک خط میں اس طوالت کے شاکی نظر آتے ہیں:۔

"یہ رسالہ بہت اطناب سے لکھا گیا ہے، اسم ظاہر کی جگہ مشکل سے کہیں ضمیر کا استعمال
ہوا ہے، جزئی واقعات اور مخالفین کی تردید میں تکرار بہت ہے، کسی شخص کا تذکرہ آگیا، تو پھر
اسکی سوانح عمری پر تبصرہ ہونے لگتا ہے، اس طرح کی مدافعت سے خالی الذہن انسان
کے دل میں خواہ مخواہ خیال پیدا ہوگا، کہ شاید لکھنے والے کو خود اپنی صداقت کا یقین نہیں ہے،
میرے خیال میں گذشتہ واقعات کی طرف اس طرح اشارہ کر دینا کافی ہے، کہ پھر مخالف کیلئے
بحث و تردید کی گنجائش باقی نہ رہے"۔ (ص ۳۱۱)

مکتوب نگار کا یہ تبصرہ ان مضامین سے متعلق ہے، جو امیر البیان نے (دوران جنگ میں شام کے حوادث) کے عنوان سے ۱۹۲۲ء کے آغاز میں سپرد قلم کئے تھے،

شامی سیاسیات سے متعلق ۱۹۲۶ء میں امیر نے مخالفین کی تردید میں مسلسل مضامین لکھے تھے، ان کا انداز بیان بھی وہی تھا، سید رشید لکھتے ہیں:۔

اس مسئلہ کو طول دینا بہت تکلیف دہ ہے، میں اپنے فرض سے غافل نہیں ....

.......آپ کی یادداشت پر میں بہت کچھ لکھ چکا، آج تک کسی نکتہ چیں نے آپ کی راست بازی اور اخلاص پر شک نہیں کیا، آپ کو خود اپنی صفائی پیش کرنے کی ضرورت نہیں، جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں"۔ (ص ۴۴۱)

مکتوبات رشیدیہ کا بڑا حصہ ممالک عربیہ کی سیاسیات سے متعلق ہے، ان کے پڑھنے سے عربی سیاسیات کی جزئیات سے بہت کچھ واقفیت ہو جاتی ہے، ترک و عرب کی آویزش، ابن سعود و آل شریف کی باہمی کشمکش، امام یمن و سلطان نجد کا اختلاف اور دوسرے بیسیوں ایسے مسئلے ہیں جن کے متعلق صحیح اور باوثوق معلومات ملتی ہیں، بعض مسئلوں (جیسے اسکندرونہ پر ترکوں کا قبضہ) کے متعلق مکتوب نگار نے پیشین گوئی کی تھی، جو آج حرف بہ حرف صحیح ثابت ہو رہی ہے لیکن اس مختصر سی صحبت میں ان کی تفصیل نہیں کیجا سکتی، اور معمولی اقتباس ناکافی ثابت ہوگا، اسلئے ہم سیاسی حصہ کو نظر انداز کرتے ہیں،

عربی سیاسیات کے علاوہ ہندوستان اور دوسرے اسلامی ملکوں اور ان کے رہنماؤں کے متعلق بھی مکتوب نگار نے اظہار خیال کیا ہے، سید رشید رضا کی مردم شناسی اور رواداری کی اس سے زیادہ مناسب کسوٹی اور نہیں مل سکتی، آئیے، دنیائے اسلام کی مختلف شخصیتوں اور متنوع مسئلوں کے متعلق انکی رائے معلوم کریں،:۔

شریف حسین بن علی

"صاحب حجاز نے نئے معاہدہ سے اپنی رسوائی مول لی، دنیائے اسلام اس کی مخالف ہو چکی ہے، اور تمام اخبارات اس کے خلاف آواز بلند کر رہے ہیں، ....

یہ ایسی راہ ہے، جسے رب العالمین کی سرکشی کئے بغیر کوئی نہیں اختیار کر سکتا، لیکن اب بھی لوگ اُسے "زعیم عرب" ماننے سے باز نہیں آتے"،

(ص ۳۲۴، مکتوب مورخہ ۱۳۴۲ھ)

"میں نے حسین اور اس کے ماننے والوں کی مدارات میں کوئی کمی نہیں کی سختی کی جگہ نرمی سے کام لیا، ...... لیکن اس کے باوجود میں خوب جانتا ہوں کہ حسین اب تک اپنی "سرداریت" کے ایوان سے اُترنے کے لئے اور اپنی "قیصریت" کی گدی چھوڑنے کے لئے تیار نہیں، اسے اب تک اپنی ہاشمی قوت یا برطانیہ عظمیٰ کی امداد کے بھروسہ پر حجاز میں رہنے کی امید باقی ہے، وہ شاید حرم شریف کو عربوں کے خون سے ناپاک کرنا نہیں چاہتا، (!!) جس طرح پہلے عربوں اور ترکوں کے خون سے ملوث کر چکا ہے، .... (ص ۳۵۹، مکتوب مورخہ ۱۳۴۳ھ)

ابن سعود

سلطان ابن سعود کے قبضہ حجاز سے تین سال پیشتر ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

"جدید معاہدہ سے متعلق میں نے ایک مضمون (روح اسلام اور عربی قومیت کا کھلا خط انگریزی قوم اور حکومت برطانیہ کے نام) لکھا ہے، لوگ کہتے ہیں، کہ یہ تحریر آتشیں قلم (قلم من نار) کی لکھی ہوئی ہے، اس کا خاطر خواہ اثر ہوا"

"اُس مضمون کی جان یہ تجویز ہے، کہ حجاز میں دنیائے اسلام کے نمایندوں کے مشورہ سے ایک جدید حکومت قائم کیجائے، اور یہ حکومت بالاتفاق غیر جانبدار تسلیم کیجائے، امید ہے کہ آپ اس خیال کی تائید کریں گے، اور عصمت[1] پاشا نیز دوسرے ترکی سیاست دانوں

[1] یہ خط اسوقت کا ہے جب عصمت پاشا لوزان کانفرنس میں شریک تھے، (۱۹۲۲ و ۲۳ء) (شکیب ارسلان)

سے اس بارے میں گفتگو بھی کریں گے، میں بھی نجد وین سے اس تجویز کے پیش کرنے کی تحریک کرتا ہوں، ...... سلطان نجد کو پیشتر لکھ چکا ہوں،

انتہائی غور و فکر کے بعد میں نے یہ رائے قائم کی ہے کہ حجاز کی حفاظت اور حج کے امن وامان کے لئے ان سے بہتر کوئی آدمی نہیں[1]،، (ص ۳۲۵)

ایک دوسرے مکتوب مورخہ ۹ محرم ۱۳۴۲ھ (یعنی قبضۂ حجاز سے پہلے) میں لکھتے ہیں:-

"آپ کو یہ اطلاع بھی دینا ضروری خیال کرتا ہوں کہ سلطان ابن سعود، جو اب تک سیاست سے الگ تھے، اب اس میدان میں آنے کو تیار ہیں، ان کی خواہش ہے کہ ان کے نمائندے بھی سیاسی کانفرنسوں میں شریک ہوا کریں، اور آپ کے دوست کے تعلقات ابن سعود اور امام یمن سے بہت اچھے ہیں، مراسلات کا سلسلہ برابر جاری ہے اور طرفین کو اعتماد بھی ہے" (ص ۳۲۹)

امان اللہ خان

سابق شاہ افغان اپنے تاریخی سفر یورپ کے سلسلہ میں مصر سے گذرے تھے، سید رشید بھی ان سے ملے، پرسکون صحبت کی انھیں تلاش تھی، شاہ افغان کو وہ نصیحت کرنا چاہتے تھے، لیکن شاہ کے حاشیہ نشینوں نے اس کا موقع ہی نہ آنے دیا، آخر مرحوم نے ایک مفصل مکتوب اور تفسیر قرآن کے اجزاء بھیج کر اداء فرض سے سبکدوشی چاہی، مگر غلام جیلانی خان سفیر اور محمود طرزی کی سازش یا بے اعتنائی سے یہ بھی نہ ہوسکا، اسٹیشن سے واپسی کے بعد تمام کتابیں واپس ملیں، اور امام مرحوم کی تمنا دل ہی میں رہ گئی ...... یہ پوری داستان سید رشید نے اپنے رفیق و ہمدم امیر شکیب سے ایک خط میں دہرائی ہے (ص ۵۱۰، ۵۱۱)

[1] ابن سعود کے قبضۂ حجاز سے پیشتر ہی سید رشید کی یہ رائے تھی، (شکیب ارسلان)

اور آخر میں یہ بھی لکھا:-

"میں نے شاہ کو یہ بھی لکھا تھا، کہ میں نے آپ (امیر شکیب) سے ان کی تعریف سن کر ملنے کی خواہش کی تھی، اور ملکی اصلاح کے متعلق مبادلۂ خیال کا ارادہ ظاہر کیا تھا،

(ص ۵۱۰)

اس پر امیر کا حاشیہ سننے اور پڑھنے کے لائق ہے،

"ہاں میں نے ان کی فرنگیت اور اہل انقرہ کی پیروی سے پہلے تعریف کی تھی، اور میرا ارادہ تھا کہ ان کے یورپ پہونچنے پر ان کے شایان شان ان کی آؤبھگت کروں، لیکن جب مصر ہی میں ان کی مغربیت کے علامات نمودار ہوئے، تو میں نے ان سے قطع تعلق کا عزم مصمم کرلیا، وہ سوئٹزرلینڈ اور خاص لوزان بھی آئے، جہاں میرا قیام تھا، لیکن میں ان سے نہیں ملا، سید رشید نے مجھے لکھا تھا کہ ان سے ملوں، اور کتابوں کی واپسی کا سبب دریافت کروں، میں نے انھیں جواب دیا کہ میں شاہ سے نہیں ملنا چاہتا،

البتہ تخت کھونے کے بعد وہ مونترو آئے، اور ان کے مصاحب خاص نے ٹیلیفون سے کہا، کہ وہ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں، تو میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا، اور کھانے پر مدعو کیا، .... دیر تک باتیں رہیں، میں نے ان کی غلطیاں گنائیں بعض کا اعتراف کیا، اور بعض کی معذرت کی، اور اکثر الزامات کی تردید کی، .... اب غالباً امان اللہ اپنے بیوقوف مشیر کاروں کی نصیحت قبول کرنے پر نادم ہیں، .... لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا، کہ انھوں نے اپنے ملک کی آزادی کی پوری حفاظت کی تھی،"

(ص ۵۱۰) حاشیہ)

مصطفیٰ کمال

کمال اتاترک اور ان کی جماعت کے دوسرے اتراک انقرہ کے متعلق

سید رشید رضا اچھی رائے نہ رکھتے تھے، نہ صرف وہ، بلکہ امیر شکیب، ابن رافعی، عبدالعزیز شاویش (مرحومین) اور شیخ شاکر جیسے آل عثمان اور ترکوں کے پرستار بھی، ترکان انگورہ کے متعلق یہی رائے رکھتے ہیں،

ابن رافعی (ایڈیٹر الاخبار) عبدالعزیز شاویش، شیخ شاکر اور امیر شکیب عرصہ تک ترکوں کی خاطر اپنی قوم سے جنگ کرتے رہے لیکن ان کے آخری اعمال ظاہر ہونے کے بعد یہ حامی مخالفت میں بھی سب سے آگے تھے،

(ص ۳۱۸، ۳۲۸-۴۴۷)

"حب فی اللہ اور بغض فی اللہ" اسی کا نام ہے، اسلامی ہند میں مولانا محمد علی مرحوم کا بھی یہی حال تھا"

ہندو زعمائے ہند

ہندوستان اسلامی برادری کا اہم رکن ہے، اسلئے قدرتی طور پر دنیائے اسلام کے دو جلیل القدر رہنماؤں کی باہمی مراسلت میں اس کا ذکر بار بار آیا ہے،

سید سلیمان ندوی

وفدِ خلافت کا ذکر کرتے ہوئے مکتوب مورخہ ۱۰ رجب ۱۳۴۳ھ میں لکھتے ہیں:-

"ان دنوں وفد ہندی (مقیم جدہ) یہاں آیا ہوا تھا، دو روز یہاں مقیم رہا، جسکی وجہ سے میرے تمام کام معطل ہو گئے تھے، صدیق مخلص مولانا (الشیخ) سید سلیمان ندوی، اور ان کے دونوں ساتھیوں سے ہندوستانی وفد کی صحیح اطلاعات ملیں، ان سے ...... کی "اکاذیب" کے بارے میں ہماری سابق رائے کی تصدیق ہوئی،......" (ص ۳۷۰)

میں نے وفد خلافت سے حجاز میں جمہوری حکومت کے قیام پر گفتگو کی، میں نے اُن سے کہا، یہی رائے ہم لوگوں کی بھی ہے، لیکن "مصلحت" کے خیال سے میں اس پر اصرار نہیں کروں گا، اُمید ہے کہ آپ کی جمعیت بھی اس پر اصرار نہیں کرے گی، رئیس وفد السید الندوی نے کہا، جمعیۃ خلافت اس پر اصرار نہیں کرے گی، ہمارے ان کے مقاصد ایک ہیں،...... (ص ۴۰۰)

حکیم اجمل خان

"آپ نے حکیم اجمل خان کے متعلق دریافت کیا ہے، میں انھیں پچیس سال پیشتر سے جانتا ہوں، جب وہ یورپ سے واپسی میں قاہرہ اترے تھے، پھر دہلی میں ملاقات ہوئی تھی..... جب ابکی دوبارہ وہ قاہرہ آئے، تو تعلقات کی تجدید ہوئی، تمام علماء کے ساتھ ان کی دعوت کی، اور دوسری دعوتوں میں ان کے ساتھ شریک ہوا،

حکیم اجمل خان ہندوستان کے مشہور لیڈروں میں ہیں، علم و عمل، عقل و تجربہ ہر اعتبار سے ان کا درجہ بلند ہے، مشہور حنفی محدث ملا علی قاری سے ان کا سلسلۂ نسب ملتا ہے،........

وہ کانگریس اور جمعیۃ خلافت کے بارہا صدر ہو چکے ہیں،....... وہ زعمائے ہند کی صفِ اول میں شمار کئے جاتے ہیں،...... محمد علی اور شوکت علی کی شہرت سے پہلے بھی ان کا پایہ بلند تھا"...... (ص ۴۰۹-۴۱۱)

امام مرحوم نے جس محبت اور تفصیل سے مسیح الملک مرحوم کا ذکر کیا ہے، اس سے پتہ چلتا ہے، کہ صاحب المنار کے دل میں مسیح الملک کی کتنی عزت تھی؟ پورے تین صفحوں میں ان کا تعارف کرایا گیا ہے، اور بعض اہم مسئلوں میں انکی رائے بھی درج کی ہے، اس سلسلہ میں امیر شکیب کا حاشیہ بھی قابلِ ذکر ہے:-

"حکیم اجمل خان ہندوستان کے ان رہنماؤں میں تھے، جن کے علم و فضل، اخلاص و صداقت پر سب کا اتفاق تھا، افسوس کہ مرحوم سے مجھے شخصی تعارف کا موقع نہ ملا، البتہ رشید بک طبیخ کا بیت المقدس سے خط آیا تھا، کہ ہندوستانی لیڈر حکیم اجمل خان ...... کی سفارش کرتے ہیں، اور آپ سے خواہش کرتے ہیں، کہ ان سے مبادلۂ خیالات کریں،..... مذکورالصدر ہندی لیڈر آئے، اور لوزان میں گفتگو رہی، موضوع سخن سیاسی تھا، اس لئے ذکر کرنا مفید نہ ہوگا، بہر حال مسلمانوں کی بھلائی کی باتیں تھیں،....... اسی سلسلہ میں سید رشید مرحوم سے حکیم اجمل خان کے متعلق

مزید حالات دریافت کرنے کی ضرورت پڑی تھی، حکیم اجمل خان کے انتقال پر سید رشید نے ان کی رافعی اور امیر شکیب ارسلان کے ساتھ "المنار" کے ایک ہی نمبر میں ان کی بھی تعزیت کی تھی،

(ص ۴۰۹ حاشیہ)

محمد علی

مسئلہ حجاز میں، مولینا محمد علی اور علامہ سید رشید رضا کا باہمی اختلاف کوئی چھپا راز نہیں، مولینا نے ہمدرد میں اور علامہ نے المنار میں ایک دوسرے کے خلاف جی کھول کر لکھا، مکتوبات رشیدیہ میں محمد علی مرحوم کا ذکر، مسئلہ حجاز کے سلسلہ میں بار بار آیا ہے، (ص ۴۱۱ - ۴۴۶ - ۴۵۶ - ۵۹)

لیکن موقع مدح وستایش میں نہیں، نمونہ کے لئے ایک مکتوب کا اقتباس کافی ہوگا،

"ہندوستان کی واپسی کے بعد محمد علی اور شوکت علی کی مخالفت (دوران قیام مکہ مکرمہ) سے بھی زیادہ تیز ہوگئی، ان کا خیال تھا کہ ابن سعود کی باگ ان کے ہاتھوں میں ہوگی، اور حجاز پر ان کا کافی اقتدار ہوگا، .... ان کے اس رویہ سے مسلمانانِ ہند میں ایک نئی پھوٹ پڑگئی ہے"

(ص ۴۵۶)

انصاری

حکیم اجمل خان سے تو باوجود اشتیاق وتمنا کے ملاقات کا موقع ہی نہیں ہاتھ آیا، لیکن ڈاکٹر انصاری خاص کر لوزان مجھ سے ملنے آئے تھے، انھیں غلط طور پر بتایا گیا کہ میں جنیوا منتقل ہوگیا ہون، بیچارے پیرس لوٹ گئے، اور حسین رؤف بک (سابق وزیر اعظم ترکی) سے اس کا ذکر کیا، حسین رؤف بے نے مجھے پیرس سے اطلاع دی، اور لکھا کہ انصاری دوبارہ مجھ سے ملنے آئین گے، .... اس کے بعد پھر یورپ وہ نہیں آئے اور گذشتہ سال ان کی وفات کی خبر ملی، "رحمہ اللہ"

(شکیب ارسلان، حاشیہ ص ۴۱۱)

سید رشید مرحوم نے مسیح الملک کے ساتھ ڈاکٹر انصاری مرحوم کا ذکر بھی بہت محبت واحترام سے کیا ہے،

مکتوبات رشیدیہ کی زبان عربی، اور وہ بھی سید رشید رضا جیسے معجز نگار صاحب قلم کی، ترجمہ میں اصل کی آب وتاب بالکل نہیں آسکی ہے، کوشش صرف یہی رہی ہے، کہ اصل مفہوم ٹھیک ادا ہوجائے، پانچسو صفحات سے یہ مختصر سا اقتباس کیا کافی ہو سکتا ہے،

ایک کتاب کے تعارف میں یہ طوالت معلوم نہیں، کس حد تک مستحسن قرار دی جائے گی، بہرحال جو کچھ لکھا گیا ہے، "حکایت" کی لذت سے متاثر اور لطف اندوز ہوکر! اسلئے کسی معذرت کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی،

احسن القصہ (یوسف زلیخا)

قدیم ہندوستانی شاعر ہاشمی کی ایک اہم مثنوی

از

جناب ملک محمد باقر صاحب متعلم، لنڈن یونیورسٹی، لندن

سید میران مصنف احسن القصہ علی عادل شاہ ثانی (۱۰۶۷ھ ۱۶۵۶ء - ۱۰۸۳ھ ۱۶۷۲ء) کے عہد میں گذرے ہیں، وطن بیجاپور تھا، سید شاہ ہاشم علوی بیجاپوری کے مُرید تھے، اس نسبت سے ہاشمی تخلص کرتے تھے[۱]، ہاشمی کی تاریخ پیدائش کے متعلق کوئی معلومات حاصل نہیں ہوسکیں، سالِ وفات مختلف کتابوں میں مختلف درج ہے، تذکرۂ الشعرائے[۲] دکن میں سالِ وفات ۱۱۹۰ھ ۱۶۷۹ء تحریر ہے، جو یقیناً غلط ہے، تمام متداول تذکروں کے بیان کے مطابق ہاشمی، شاہ ہاشم اور علی عادل شاہ عادل کے معاصر تھے، شاہ ہاشم اور علی عادل شاہ ثانی بالترتیب ۱۰۵۶ھ[۳] ۱۶۴۶ء اور ۱۰۸۳ھ[۴] ۱۶۷۲ء تک بقیدِ حیات تھے، اسلئے ہاشمی کا ۱۱۹۰ھ ۱۷۸۴ء یعنی اپنے معاصرین سے ایک سو سال بعد تک زندہ رہنا، ناقابلِ یقین ہے، گل رعنا[۵] کے مصنف نے ہاشمی کا سالِ وفات ۱۰۹۰ھ ۱۶۷۹ء لکھا ہے لیکن

[۱] روضۃ الاولیاے بیجاپور صفحہ ۹، بساتین السلاطین صفحہ ۴۳۲، تذکرۂ شعراے دکن صفحہ ۱۲۰۲، گل رعنا صفحہ ۲۷ [۲] صفحہ ۳۲۱ [۳] ص ۱۲۰۲ [۴] روضۃ الاولیاے بیجاپور ص ۴۹ [۵] MOHMMADAN DYNASTIES ص ۴
بساتین السلاطین، مخطوطہ انڈیا آفس ورق ۲۱۰ [۶] گل رعنا صفحہ ۲۷

یہ بھی غلط ہے، کیونکہ جیسا کہ آگے چل کر بیان کیا جائے گا، ہاشمی نے اپنی تصنیف احسن القصہ ۱۰۹۹ھ ۱۶۸۸ء میں ختم کی تھی، اور یقیناً وہ اس سال تک زندہ تھا، اُردوے قدیم[۱] کے مصنف نے اعراس بزرگان کے حوالہ سے ہاشمی کے انتقال کی تاریخ ۱۰۹۶ھ ۱۶۸۵ء مقرر کی ہے، جو غالباً درست ہے، لیکن یقین سے صرف یہی کہا جاسکتا ہے، کہ وہ ۱۰۹۹ھ ۱۶۸۸ء تک ضرور زندہ تھا، کیونکہ اسی سال اس نے احسن القصہ کی تکمیل کی تھی،

ہاشمی کے دوسرے سوانحِ حیات کے متعلق ہمیں اس سے زیادہ علم نہیں، کہ وہ اندھا تھا، اس حقیقت کا اظہار ہاشمی نے بار بار اپنی تصنیف احسن القصہ میں کیا ہے، ملاحظہ ہو،

میرے ہاتیں کچھ بی ہوتا قلم — نہ اپس دکھاتا میں عالم سوں کم
وے کیا کروں مجبو ہے لاعلاج — ہرک کوئی عاجز ہے انکھیاں کے باج[۲]

احسن القصہ ایک طویل مثنوی ہے، ہاشمی نے اسکو ذہن میں رکھنے کے بعد صفحۂ قرطاس پر منتقل کرائی تھی، یہ کام بہت دشوار ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے، کہ ہاشمی کو صانعِ ازل نے غیر معمولی حافظہ عطا کیا تھا، ہاشمی نے خود اپنی صعوبت کا بیان یوں کیا ہے،

مشقت ہے میری دیکھو تکیک — بولوں ہیں بیتاں تو رہے یاد ٹنک
توں اس سارے قصے کوں ترتیب سوں — رکھوں یاد کیوں میں میری جیب[۳] سوں
خدا کا فضل مجبو تھا بیعد — رکھیا یاد قصے کوں پاکر مدد[۴]

مثنوی کی تکمیل پر شاعر خود اپنے کام پر متعجب ہے، اور اس کا اظہار ان اشعار میں کرتا ہے،

تعجب ہے ہویگا تہار[۵] تہار — انکھیان نین[۶] پرویا کیوں موتیاں کے ہار

[۱] صفحہ ۹۱ [۲] احسن القصہ ورق ۲۵۳ [۳] یعنی زبان (پنجابی) [۴] احسن القصہ، ورق ۲۵۳ [۵] جگہ جگہ جابجا [۶] نہیں

جگت یوں پڑے ناؤں کا تیری بات   انکھیاں دو نین ہیں ہو گیا ہی کتاب[۵۱]

ہاشمی کی ظرافت طبیعت اور قوت کے متعلق بساتین السلاطین کے مصنف محمد ابراہیم زبیری نے ایک پرلطف واقعہ بیان کیا ہے، جسے قارئین کی دلچسپی کے لئے نقل کیا جاتا ہے، بہت ممکن ہے کہ ہاشمی نے سید مسعود خان کے اہل خانہ کی ہو بہو تصویر اپنی غزل میں نہ کھینچی ہو لیکن اس تصویر کا اصل کے لگ بھگ ہونا بھی اندھے شاعر کا معجزہ ہے، افسوس ہے کہ یہ غزل محفوظ نہیں رہی ورنہ واقعات پر قیاس کرنے کا زیادہ موقع ملتا،

"وسیدی مسعود خاں با ہاشمی رابطہ اخلاص بل اعتقاد عظیم داشت، روزے کہ در مجلس با حرم نشستہ بود ہاشمی را اندرون محل طلبید، اہل حرم بہ اعتماد آنکہ بصیرت پروانکردہ بجائے خود اقرار گرفتہ بودند، چوں ہاشمی اندرون در آمد، ہمینکہ در محل قدم گذاشت شروع آغاز نمود، کہ دراں غزل شکل وشمایل ورنگ لباس کہ حرم دراں وقت پوشیدہ بودند واقسام زیوری کہ بر تن داشتہ تمامی من وعن شرح گویا دیدہ می گوید، چوں اہل حرم دیدند کہ حسب حال ہر یک از ما شکل وشمایل ورنگ لباس بیان می کند آں ہمی نخواہد بود، بیکبارگی از جاجستہ برمیدند، و در پردہ شدند[۵۲]

کہا جاتا ہے کہ ہاشمی نے احسن القصہ کے علاوہ یوسف زلیخا ایک دیوان ریختی اور کچھ مرثیے بھی لکھے تھے، محمد ابراہیم زبیری نے اپنی تصنیف بساتین السلاطین میں ہاشمی کے ذکر میں انکی تصنیفات یوسف زلیخا اور دیوان کا ذکر مندرجہ ذیل الفاظ میں کیا ہے:۔

"ونیز از جملہ ہندی گویان آں زمان یکے میاں ہاشمی است کہ فیض لعاب دہن مبارک

۵۱ احسن القصہ، ورق ۵۵، ۵۲ بساتین السلاطین مخطوطہ برٹش میوزیم، ورق ۹۲ ۵۳ اردو شہ پارے ص۴۵، اردوے قدیم ص۹۵، تاریخ ادب اردو ص۳۰،

حضرت سید شاہ ہاشم قدس سرہ زبان شیریں بیان کشادہ از سخنوران گوے سبقت ربود، قصۂ یوسف زلیخا را بہ محاورۂ آں زماں بزبان دکھنی نظم نمودہ و دیوان غزل مشتمل بر مضامین سنجیدہ و تلازمات شعریہ ہم وارد کہ مقبول طبائع افتادہ و در شعر طرزی نادر و روشنی غریب ورزیدہ کہ کسے برو سبقت نکردہ باوجودیکہ بصیر مادر زاد بود، اما بہ بصیرت چشم دانش بینا،[۵۱]

اس بیان سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ہاشمی نے یوسف زلیخا اور غزلیات کا دیوان مرتب کیا تھا، یہ دونوں تصنیفات اب تک مختلف کتب خانوں میں محفوظ ہیں، یوسف زلیخا کے مخطوطے حکیم شمس اللہ قادری[۵۲] کے پاس اور کتب خانہ مخطوطات مشرقیہ مدراس، اور جرمن[۵۳] اورنٹیل سوسائٹی کے کتب خانے میں موجود ہیں، ریختی کے دیوان کا ابھی تک ایک ہی مخطوطہ دستیاب ہوا ہے، جو آغا حیدر حسن[۵۴] صاحب دہلوی کے کتب خانہ میں ہے، ہاشمی کے چند مراثی ایڈنبرا یونیورسٹی لائبریری کی بیاض مراثی میں شامل ہیں، ہاشمی کی ان تصنیفات کے روشنی میں آجانے سے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا ہے، کہ اُس نے مندرجۂ ذیل اصناف سخن میں طبع آزمائی کی تھی، اور اس کے نتائج افکار مخطوطوں کی صورت میں اب تک محفوظ ہیں،

۱۔ مثنوی (یوسف زلیخا)

۲۔ غزلیات (دیوان ریختی)

۳۔ مراثی (جو ایڈنبرا یونیورسٹی کی بیاض میں شامل ہیں)

۵۱ بساتین السلاطین ص ۴۳۲، مخطوطہ انڈیا آفس، ورق ۳۱۵-ب، ۵۲ اردوے قدیم ص۱۲۷،

۵۳ فہرست کتب خانہ جرمن اورنٹیل سوسائٹی جلد دوم ص۶۶،

۵۴ اردو شہ پارے، ص۴۲،

سید محی الدین قادری پہلے تذکرہ نگار ہیں، جنھوں نے یہ لکھا ہے، کہ مندرجۂ بالا تین تصنیفات کے علاوہ ہاشمی نے احسن القصص کا ترجمہ بھی کیا تھا، اور یہ تصنیف یوسف زلیخا سے علٰحدہ تصنیف ہے،[1] اس بیان کی تائید میں قادری صاحب نے پیرزادہ غلام محی الدین کی سند پیش کی ہے جس کی تصنیف احوالِ سلاطین بیجاپور کے مخطوطے سے راقم کو ہاشمی کے متعلق صرف مندرجۂ ذیل اندراج حاصل ہو سکا ہے، پیرزادہ غلام محی الدین کا بیان ہے:-

"وسوائے اینان بسیار شعر فرس گویان و ہندی گویاں بودند، چنانچہ یکے از آنہا
ہاشمی است کہ بزبان ہندی احسن القصص را در سلک شعر (......؟) کشیدہ"[2]

اس اقتباس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ہاشمی نے احسن القصص کو قدیم ہندوستانی (جسے اس وقت ہندی کے نام سے پکارا جاتا تھا) میں منظوم کیا، جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے، بساتین السلاطین کے مصنف کا بیان ہے، کہ ہاشمی نے یوسف زلیخا کے قصے کو منظوم کیا، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یوسف زلیخا اور احسن القصص ایک ہی تصنیف کے دو مختلف نام ہیں، یا قادری صاحب کے قول کے مطابق یہ دو مختلف تصنیفات کے نام ہیں، جہاں تک میرا خیال ہے، قادری صاحب اصل تصنیف تک رسائی نہ ہونے کی وجہ سے اس غلط نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یوسف زلیخا اور احسن القصص ہاشمی کی دو مختلف تصنیفات ہیں، جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، ہاشمی کی یوسف زلیخا کے اب تک تین ہی مخطوطے دستیاب ہوئے ہیں، اور بدقسمتی سے قادری صاحب کو ان میں سے کوئی نسخہ دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا حالانکہ ان تین نسخوں کے علاوہ برٹش میوزیم میں بھی ایک نسخہ محفوظ ہے، برٹش میوزیم کے عظیم الشان کتبخانے کو دیکھ کر جہاں علمی ذخائر کو جمع کرنے کی کوشش پر عجائب خانے کے کارپردازوں کو داد دینی پڑتی ہے، وہاں آدمی یہ شکایت کئے بغیر بھی نہیں رہ سکتا

[1] اردوے شہ پارے ص ۴۱ [2] احوال سلاطین بیجاپور، ورق ۳۱

کہ اب تک ان ذخائر کی تفصیلات کو مرتب کرنے کی پوری سعی نہیں کی گئی، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ابھی تک بہت سی قدیم اور علمی کتابیں انبار کی صورت میں کتبخانہ میں جمع ہیں، اور چونکہ اس انبار تک پڑھنے والوں کو پہنچنے بھی نہیں دیا جاتا، اسلئے نہیں کہا سکتا کہ اس ڈھیر میں کیا کیا جواہر نہاں ہیں، خوش قسمتی سے راقم کو ایک ایسا مخطوطہ برٹش میوزیم میں ملا جس کے متعلق ایک دستی فہرست میں صرف اتنی تفصیل درج ہے "یہ ایک دکنی مخطوطہ ہے"، مخطوطہ نکلوا کر دیکھنے سے معلوم ہوا کہ یہ ہاشمی کی وہی تصنیف ہے، جسے یوسف زلیخا کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اور جس کا اور کوئی نسخہ اب تک انگلستان میں نہیں پایا جاتا، ہاشمی کی یہ طویل مثنوی ۱۱ × ۷ کے ۲۲۷ اوراق پر مشتمل ہے، ایک صفحہ میں اوسطاً گیارہ سطور ہیں، برٹش میوزیم کا مذکورہ مخطوطہ محی الدین خان سکنۂ نہاور کا لکھا ہوا ہے، تاریخ کتابت گیارہ شوال ۱۳۵۵ھ / ۱۹۳۶ء درج ہے، لیکن ۱۲۵۵ھ / ۱۸۳۹ء کی بجائے سہواً ۱۳۵۵ھ / ۱۹۳۹ء لکھا گیا ہے، اس مخطوطے کے مطالعے سے راقم کو یہ پتہ چلا کہ یوسف زلیخا اور احسن القصص ہاشمی کی ایک ہی تصنیف کے دو نام ہیں، اور قادری صاحب سے ان ناموں کو دو مختلف تصانیف سے منسوب کرنے میں غلطی ہوئی ہے، نہ جانے کیوں ہاشمی نے کتاب کا نام احسن القصص کی بجائے احسن القصہ رکھا ہے، بہرحال راقم بھی اسے اسی نام سے منسوب کریگا،

مثنوی کے آغاز میں ہاشمی نے اپنی اس مثنوی کے متعلق لکھا ہے،

کہ یو قصہ توں بول عرفان سوں — کتا ہوں[1] کے اب دکھے سن کان سوں
کہا احسن القصہ جس کوں خدا[2] — کتا ہوں میں اس کا تجھے ابتدا[2]

مثنوی کے آخر میں ہاشمی نے مصر مثنوی کے اسی نام کا اعادہ کیا ہے:-

مصر میں کئے جیونکہ یوسف نے راج — سنہار کوں یتوں ہوا آرام آج

[1] کہتا ہوں [2] احسن القصہ، ورق ۱۴۱،

کھن ہار کا ہوئے تازہ دماغ	ننر نہار کا ہوئے دل باغ باغ
رکھیا احسن القصہ رب جس کا نام	تجھے کھول کریں اد بو لیا تمام[1]

اس سے کچھ آگے جہاں اُس نے مثنوی کے نفسِ مضمون یا دوسرے نام کا ذکر کیا ہو وہان اسے زلیخا کے قصے کے نام سے پکارا ہے،

اگر توں بی[2] اپنا منگے رکھنے نام	زلیخا کے قصہ کوں کراب تمام[3]

ہاشمی کے ان اشعار سے صاف طور پر ظاہر ہے کہ احسن القصہ اور یوسف زلیخا اسکی ایک ہی تصنیف کے دو نام ہیں، علاوہ ازین راقم نے جب سید شمس اللہ کے مملوکہ مخطوطۂ یوسف زلیخا کے اقتباسات کا مقابلہ برٹش میوزیم کے مخطوطۂ احسن القصہ سے کیا، تو معلوم ہوا، کہ یہ اقتباسات ایک ہی کتاب کے ہیں[4]، اس لئے یہ کہنا کسی طرح بھی درست نہیں کہ احسن القصہ اور یوسف زلیخا ہاشمی کی دو مختلف تصانیف کے نام ہیں،

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ احسن القصہ کے متعلق جو معلومات اس کے مخطوطے سے بہم پہنچ سکی ہیں، وہ قارئین کی خدمت میں پیش کر دی جائیں،

ہاشمی کے سوانح حیات کے متعلق جو کچھ اس کی تصنیف احسن القصہ اور دوسری تاریخون سے معلوم ہو سکتا ہے، وہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے،

علی عادل شاہ ثانی والیٔ بیجاپور کے دربار کا شاعر، ملک الشعرا نصرتی تھا جس کا انتقال ۱۰۸۵ھ میں ہوا، معلوم ہوتا ہے کہ ہاشمی کو نصرتی کا ہم عصر ہونے کے باوجود اس کی جیسی شہرت اور قبولیت نصیب نہ ہوئی، چنانچہ بساتین السلاطین اور احوال سلاطین بیجاپور کے

[1] احسن القصہ، ورق ۲۵۱، [2] بھی [3] احسن القصہ ورق ۲۵۲، [4] سید شمس اللہ نے اردوے قدیم کے ملحقات میں ص ۲۰ پر یوسف زلیخا کے مخطوطہ سے جو اقتباس دیا ہے وہ برٹش میوزیم کے مخطوطہ احسن القصہ کے ورق ۲۱۵ کے مطابق ہے،

مصنفین نے جس مدحیہ انداز میں نصرتی کا ذکر کیا ہے، اس سے کہیں کم تعریفی کلمات ہاشمی کے لئے استعمال کئے ہیں، ہاشمی خود بھی نصرتی اور اسکی شاعری کا معترف ہے، چنانچہ جہان اُس نے یہ بیان کیا ہے کہ بقاے نام کی خواہش نے اُس سے مثنوی احسن القصہ لکھوائی ہے، وہان اُس نے فارسی کے نامور شعرا کے علاوہ نصرتی اور اسکی دو مثنویون علی نامہ اور گلشن عشق کی بھی داد دی ہے

ہوئے ہیں جکوئی آج لگ[1] نام دار	گئے ہیں یکیک اس کو اد یادگار
رہا سد کد[2] ستے سکندر کا نام	رہا نام جم کیا کسر کو جام
اول کوئی رستم اتھا[3] تیغ زن	رہا نام اوس کا تو مایا رود(؟) کدمن
گئے کر کر لقمان حکمت کے کام	ادیتی رہیا اون کا جگمیں یو نام
عدالت سون نوشیرواں کا ہے ناؤں	سخاوت میں حاتم ہوا تھاؤں تہاؤں[4]
جیسے جو سکت تھی کیا ویسے کام،	ادیتی رہا اُن کا عالم میں نام،
سکت دارون کے نانوں ہی تہاؤں تہاؤں	تو کیوں بے سکت کا رہے جگ میں ناؤں
جو پیچ[5] ناؤن رکھنے کون منگتا ہے آج	تو میں یک کتا[6] ہون تجھے کر علاج
.. ..	.. ..
خدایا اس توفیق سے منگ شتاب	تیرا ناؤں ہتو[7] رہے جو بولے کتاب
کہیں ہیں جکوئی مرد شیریں کلام	اُنو[8] کا بی[9] لیتا ہون میں بعضے نام[10]

اِن اشعار کے بعد ہاشمی نے فارسی شعرا، عنصری، سعدی، خسرو اور جامی کے نام گنوائے ہین، اور ان کی تعریف کے بعد نصرتی کے متعلق لکھا ہے،

[1] تک [2] اسے [3] تھا [4] ٹھاؤں یعنی جا بجا [5] پیچھے [6] کہتا، [7] تو، [8] ان کا [9] بھی، [10] احسن القصہ، ورق ۲۵۱،

دکھن میں ہوا نصرتی پُر ہنر — جو ہے شعر جس کے سکل معتبر[۱]،

علی نامہ، گلشن کا[۲] قصہ بنا — دیا زیب و زینت دکھن کوں سدا[۳]

ہاشمی نے مثنوی احسن القصہ اپنے پیر و مرشد شاہ ہاشم کے ایما پر منظوم کی تھی، ہاشمی کے قول یہ مثنوی ۱۰۹۹ھ میں تکمیل کو پہنچی، اور اس میں کل پانچہزار ایک سو بیاسی ابیات ہیں، برٹش میوزیم کے مخطوطے میں تمام ابیات محفوظ ہین،

کہا شاہ ہاشم مجھے یوں نواز — دیا واں ایمان کر سر فراز

عنایت کا جب مجھ پو کھولیا ہے باب — منگیا کرنے میں تب مرتب کتاب

اگر کوئی بیتون کا پوچھے شمار — کہ یک سو بیاسی رہے پنج ہزار

مرتب کیا میں یو قصے کوں تو — ہزار برس پر تھے جو نود پہ نو،

میرا شعر دلسوں سنے گا جنے — مرے حق میں ایمان منگیگا اونے،

کہ الحمد للہ یو قصہ تمام، — ہوا سو محمد پو ہے نت سلام[۴]،

مثنوی احسن القصہ کے مضامین جامی کی یوسف زلیخا، اور احسن القصص کی دوسری روایات کے مطابق ہیں، چونکہ ہاشمی مادرزاد اندھا تھا، اسلئے ظاہر ہے، کہ اس نے کوئی کتاب مطالعہ نہین کی، اور اسکی تصنیف احسن القصہ کسی پہلی لکھی ہوئی کتاب کا لفظی ترجمہ نہیں، بلکہ اس نے سنی ہوگی، متداول روایات کی مدد سے اپنی مثنوی مکمل کی، اور اس خوبی سے تمام واقعات کو قلبند کیا، کہ مثنوی کے مطالعہ کے بعد اس کے ذہن رسا کی داد دینی پڑتی ہے، احسن القصہ کی زبان دہی قدیم ہندوستانی ہے، جو ہاشمی کے زمانے میں ہندوستان میں بولی بھی اور لکھی جاتی تھی، موجودہ ہندوستانی سے قدیم ہندوستانی متعدد حیثیتوں سے مختلف ہے، اسلئے

[۱] سب، [۲] گلشن عشق، مصنفہ نصرتی [۳] احسن القصہ ورق ۲۵۲ [۴] ” ورق ۲۵۵،

اس زمانے میں احسن القصہ کی زبان کچھ عجیب سی معلوم ہوتی ہے، لیکن اس زمانے کے شعرا مثلاً نصرتی، شاہ ملک یا امین کی تصانیف سے جب ہاشمی کی مثنوی کا مقابلہ کیا جاتا ہے، تو معلوم ہوتا ہے، کہ ہاشمی پُرگو ہونے کے باوجود نہایت سلیس نگار تھا، چنانچہ وہ خود بھی کہتا ہے، :-

اگر توں بی اپنا منگے رکھنے نام — زلیخا کے قصہ کوں کراب تمام،

سو اوس شعر کتیں توں کہنے سوں لول — یو معلوم ہوئے ہر کسی کوں دکھول

سلیس بول قصہ جو ہے ہوشمند — سلیس کون کریں عاقلاں سب پسند

سلیس بولنا نازو کی کا ہے کام — سلیس کوں عزت ہی جگ میں تمام[۱]

مثنوی کی ابتدا ری حمد و منقبت سے ہوتی ہے، اس عہد کے دوسرے شعرا کی طرح دربار شاعر ہونے کے باوجود ہاشمی نے حاکم وقت کی مبالغہ آمیز تعریف سے پرہیز کیا ہے، بلکہ اپنی تصنیف کی مقبولیت کے لئے بھی خدائے عزوجل سے دعا مانگی ہے، یہ دعا خلوص جذبات کا نہایت پاکیزہ نمونہ ہے، اسلئے قارئین کی دلچسپی کے لئے نقل کیجاتی ہے،

دُعا

جو کوئی داد گر ہور اچھیں باشعور — پڑھا شعر میرا توں انکے حضور،

اور ٹھیں میرے پر تجھو نیں ہوشاد — میں خشنود اچھوں ہور دیویں سواد

میرا شعر کر بادشاہاں پسند — پسند کرکے راکھیں جو سب ہوشمند

میرا شعر میں علم کا دے ہنر — جو عالم ہوین سنکہ خوش مجھ اوپر

میرے شعر میں دے شجاعت کا بل — تو خوش ہوئے سن کر دلیران سکل

[۱] احسن القصہ، ورق ۲۵۲ [۲] ” ورق ۱۲۸،

میرے شعر میں عشق ہو عیش بھر،　　تو عاشق رکھیں دلمیں تعویذ کر،

میرے شعر میں دے لطافت کے زیب　　جو عاشق ہویں سنکہ دہن فریب

طبع کوں ادک کر میرے دن بدن　　جو کچھ دلمیں لاآؤں سو بولوں لقین

میرا شعر جگ کوں دیکھا بانمک　　تو لذت لگے ہو شمند انکوں جک

میرا شعر جگکوں دیکھا کر سری　　ہر یک کس کون پڑنکیتیں دے اُسی

پڑہنہار کا کرتوں تازہ دماغ　　سنہار کا کرتوں دل باغ باغ

یہ مضمون تشنہ رہے گا، اگر مثنوی احسن القصہ کا کچھ انتخاب درج نہ کیا جائے، اسلئے قارئین کی دلچسپی کے لئے وہ اشعار پیش کئے جاتے ہیں جن میں ہاشمی نے کائنات میں عشق کے مظاہر اور عشق کی اہمیت کی وضاحت نہایت فلسفیانہ انداز میں کی ہے، اس نظم سے احسن القصہ کی زبان کا اندازہ بھی قارئین کر سکیں گے،

عشق

ہر یک شے میں گویا سومند[1] ہر[2] فراغ　　ویسے عشق تسمیں ہوا نور چراغ

کہ جیوں کوئی شیشہ نین بھرتا ہے رنگ　　ویسے عشق ہر شے میں تیوں بیدرنگ

اگر عشق نیں[2] ہے تو چندر کوں نور　　تو کیا واسطے نت[3] یو دیتا ہے سور[4]

اگر عشق نیں ہے تو دریائے آب　　پلاتا ہے بادل کوں کئے بیحساب[5]

اگر عشق نیں ہے تو کے دھرتری[6]　　نوی[7] رتمیں کرتی ہے کسوت ہری

اگر عشق نیں ہے تو کے پھو بن　　رہے جلوہ گر ہو کہ چاروں[8] کدھن

اگر عشق نیں ہے تو کے تہار تہار　　پریشان ہو بارا پھرے جک مہار

اگر عشق نیں ہے تو شبنم پور و　　گگن[1] نت کے پھرتا پریشان ہو

اگر عشق نیں ہے تو کے نس[2] سنوار　　لے آئی سنگاتی[3] ستاریاں کا بہار[4]

اگر عشق نیں ہے تو کے باغ باغ　　پھریں کو ملاں جلکہ[5] ہو داغ داغ

اگر عشق نیں ہے تو کے یو چکور　　نین[6] میں دیا ہے سو چندر کوں تہور[7]

اگر عشق میں تو پپیہا[8] ہو تند،　　پکرتا ہے کے سوانت کا موتیں بوند[9]

ہاشمی کی تصنیف احسن القصہ سے تیئیس سال قبل ابن نشاطی نے ۱۶۵۵ء میں اپنی معرکۃ الآرا مثنوی پھولبن میں اسی قدیم ہندوستانی زبان میں اسی موضوع یعنی کائنات میں عشق کے وجود پر ایک نظم لکھی تھی، دونوں نظموں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے، کہ ہاشمی نے ابن نشاطی کی نظم ضرور دیکھی تھی، اور اس نظم سے وہ اسقدر متاثر ہوا تھا، کہ بعض مقامات پر توارد واقع ہو گیا ہے، ابن نشاطی کی نظم ملاخطہ ہو:

عجب کچ عشق ہے کچ عجب عشق　　جدھر دیکھے ادھر سب عشق ہی عشق

اگر نیں عشق تو عالم ہوا کیون　　مٹھی بھر خاک سوں آدم ہوا کیون

اگر نیں عشق تو یوں آگ جوشاں　　دریا کیا واسطے ہوتا خروشاں

اگر نیں عشق تو یوں عمر سارا　　پریشاں ہو کے پھرتا ہے بارا

اگر نیں عشق تو کے سبز ہیں جھاڑ　　کھڑے کے پاؤں اپنے کاریوں باڑ

اگر نیں عشق تو تن کوں لاخاک　　سبب کیا رات دن پھرتا ہے افلاک

اگر نیں عشق تو اسد ھات تملس　　ہر یک جاکیا بدل روتا ہے بادل

اگر نیں عشق تو یوں کے جلے آگ　　ہمیشہ کائی کوں اٹھتے ہے یوں جاگ

اگر بس عشق تو وہ برہنی دھن
چلے کیوں چھوڑ انپا مال ہور دھن[۱]

اس مضمون کی ترتیب میں مندرجۂ ذیل کتب سے مدد لی گئی ہے،

۱۔ **فہرست کتب خانہ جرمن اورنٹیل سوسائٹی**:- جلد دوم، مطبوعہ لائپزش ۱۹۱۱ء

۲۔ **احسن القصہ**:- مصنفہ ہاشمی مخطوطہ برٹش میوزیم اورنٹیل ۱۱۲۹۸،

۳۔ **بساتین السلاطین**، مصنفہ محمد ابراہیم زبیری، مطبوعہ حیدرآباد ۱۳۱۰ھ، مخطوطہ کتبخانہ انڈیا آفس فارسی ۲۲۰۶، مخطوطہ کتبخانہ برٹش میوزیم ایڈیشنل ۲۶۲۶۹،

۴۔ **منتخب اللباب** جلد سوم، مصنفہ محمد ہاشم خافی خاں، مطبوعہ کلکتہ ۱۹۲۵ء

۵۔ **انوار سہیلی**:- مترجمہ محمد ابراہیم بیجاپوری، مطبوعہ مدراس ۱۸۴۰ء،

۶۔ **تذکرہ شعرائے دکن**، جلد دوم مصنفہ مولوی عبد الجبار، مطبوعہ حیدرآباد ۱۳۲۹ھ

۷۔ **گل رعنا**، مصنفہ مولوی عبد الحئی صاحب مطبوعہ اعظم گڈھ ۱۳۴۳ھ،

۸۔ **اردوئے قدیم**، مصنفہ حکیم شمس اللہ قادری، مطبوعہ لکھنو ۱۹۳۰ء،

۹۔ **اردو شہ پارے**، مصنفہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری، مطبوعہ حیدرآباد ۱۹۲۹ء،

۱۰۔ **تاریخ ادب اردو**، مصنفہ ڈاکٹر گریہم بیلی، مطبوعہ کلکتہ ۱۹۳۲ء،

۱۱۔ **روضۃ الاولیائے بیجاپور**، مصنفہ محمد ابراہیم زبیری مطبوعہ رائچور ۱۳۰۳ھ،

۱۲۔ Mohammadan Dynasties مصنفہ لین پول، مطبوعہ پیرس ۱۹۲۵ء

۱۳۔ **بیاض مراثی** ایڈنبرا یونیورسٹی لائبریری،

۱۴۔ **احوال سلاطین بیجاپور**، مصنفہ پیرزادہ غلام محی الدین مخطوطہ کتبخانہ برٹش میوزیم ایڈیشنل ۲۶۲۷۰،

۱۵۔ **پھول بن**:- مصنفہ ابن نشاطی، مخطوطہ کتبخانہ انڈیا آفس، فارسی ۱۴۰،

---

[۱] پھول بن، ورق ۴۳

افکارِ مضطر

از

جناب مولینا بدر الدین صاحب علوی، استاذ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

کلام لطف کے عنوان سے میرا ایک مضمون معارف نومبر ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا تھا جس میں استاذ العلماء حضرت مفتی محمد لطف اللہ صاحب رح کے والد مولوی اسد اللہ صاحب کا ضمنی تذکرہ آگیا تھا، اس کو دو سال ہوئے طبیعت بے چین ہے، کہ پھر حضرت کے سلسلہ سے کسی موضوع پر قلم کو جنبش ہو ع

باز گو از نجد و از یارانِ نجد

اس وقت اور تو کچھ نہ ہو سکا، مولوی اسد اللہ صاحب ہی کے چند نتائج افکار حوالۂ قلم ہیں:

مولوی اسد اللہ صاحب کو خدا نے دو نعمتیں دیں، سب سے بڑی جو رحمتِ الٰہی کہی جا سکتی ہے یہ تھی کہ استاذ العلماء رح جیسا فرزند عطا فرمایا، جن کے فیض نے ایک عالم کو عالم بنا دیا[۱]، تین بھائیوں کے بیچ میں خدا نے یہ فرزند دیا، باپ نے بجا طور پر "چراغم" تاریخ کہی، جو چراغ من بھی ہے، اور "چرا غم" پڑھیے، تو اس میں (چرا استفہام انکاری ہو کر) غم کی نفی بھی، بیٹے کی سعادتمندی دیکھیے، کہ باپ کے آخر وقت میں ایسی تیمارداری کی جسکی نظیر شاید نہ ملے گی، دوا لینے کے لئے بگھنہ سے کول چودہ میل پیادہ پا جانا، اور دن کے دن واپس آنا مدتوں تک روزانہ معمول رہا،

---

[۱] ندوۃ العلماء کا اجلاس تھا، استاذ العلماء صدر، شاگردوں اور شاگردوں کے شاگردوں کا جم غفیر شریک، ایک شاگرد رشید کی زبان سے بیساختہ یہ جملہ نکلا، میرے استاد نے ایک عالم کو عالم بنا دیا،

دوسری نعمت ذکاوت تھی، جس کے لئے وہ مشہور تھے، اسی ذکاوت کا نتیجہ تھا، کہ سنین عیسوی کا ایسا قاعدہ دریافت کیا، جس سے غیر متناہی زمانہ کی تاریخوں کے دن معلوم کر سکتے ہین،

اس قاعدہ کے استخراج کا واقعہ دلچسپی سے خالی نہیں منشی نبی بخش سالک اکبر آبادی نے ازراہ تعجب ایک جنتری کا ذکر کیا جس سے بارہ سال کی تاریخیں معلوم ہو سکتی تھیں، مولوی اسد اللہ صاحب نے فرمایا، کہ عیسوی سنین کی ایسی جنتریان بن سکتی ہیں، کوئی تعجب کی بات نہیں ہے، مگر منشی جی تعجب پر قائم رہے، اور طنزاً کہا آپ تو بڑے ذہین مشہور ہیں، آپ ہی نے کوئی ایسی جنتری بنائی ہوتی، مولوی صاحب نے اس وقت خاموشی اختیار کی لیکن جلد ہی یہ قاعدہ تیار کرکے منشی جی کا تعجب دور کر دیا، بلکہ اور تعجب بڑھا دیا،

اس قاعدہ کے ذریعہ ہر عیسوی سنہ کے ہر مہینہ کی یکم تاریخ کا دن معلوم کر سکتے ہین[1] اس کے بعد مہینے کے پورے دن معلوم ہو جاتے ہیں،

۱- مہینوں کا تعلق دنوں سے قرار دیکر اشعار ذیل میں بیان کر دیا ہے،

اکتوبر و جنوری بہ یک شنبہ بدان ۔ دوشنبہ پی مئی بگوئیم عیان

سہ شنبہ اگست پنجشنبہ درجون ۔ جولائی و اپریل بہ شنبہ مقرون

بے شبہہ چہار شنبہ مارچ خوانی ۔ ہم فروری و نومبر اورا دانی

در جمعہ ستمبر و دسمبر باشد ۔ این نکتہ بہ از ہزار گوہر باشد

۲- جس سنہ کے کسی مہینہ کی یکم کا دن معلوم کرنا ہے، اسکو سوایا کرین، سوایا کرنے میں کبھی کسر آئے گی، ایسی حالت میں اسکو کامل کرکے ایک پورا عدد بڑھالین اور مجموعہ کو سات پر تقسیم کرین،

[1] اس قاعدہ کو منشی رحمت اللہ مرحوم نے اپنی بڑی جنتری ۱۸۹۱ عیسوی میں ص ۴۴ پر بہت خوبی سے چھاپا تھا،

جو باقی رہے اسکو ذہن میں محفوظ رکھیں، اگر تقسیم سے کچھ باقی نہ بچے، تو سات ہی کو ذہن میں رکھین اب دیکھیں کہ اشعار مین اس مہینہ کا تعلق کس دن سے ظاہر کیا گیا ہے، اسی دن سے ایام ہفتہ کو بقدر اعداد محفوظ شمار کرین جس دن پر شمار پورا ہو، اسی دن مطلوبہ مہینہ کی پہلی تاریخ ہوگی، اگر سنہ کا سوایا کرنے میں کسر نہ آئے، اور اعداد صحیح حاصل ہوں تو صرف جنوری اور فروری کے لئے مذکورۂ طریقہ پر عمل کرین، اور باقی مہینوں کے لئے سوائے پر ایک عدد بڑھا دین، اسکے بعد تقسیم اور بقیہ عمل حسب سابق کرین،

مثالین:-

۱- یکم جون ۱۸۹۱ء: سوایا ۲۳۶۳ ¾ ہوا کسر کی تکمیل کے بعد ۲۳۶۴ ہوئے سات سے تقسیم کیا پانچ باقی بچے، ذہن میں رکھا، اشعار میں دیکھا، تو جون پنجشنبہ سے متعلق ہے، اسلئے پنجشنبہ سے پانچ دن شمار کئے، دوشنبہ پر شمار پورا ہوا، معلوم ہوگیا، کہ دوشنبہ کو پہلی تاریخ جون کی تھی،

۲- یکم اکتوبر ۱۸۶۰ء: سوایا ۲۳۲۵ صحیح ہے، ایک بڑھایا ۲۳۲۶ ہوئے تقسیم کیا، دو باقی رہے، اکتوبر کا دن یکشنبہ ہے، شمار دوشنبہ پر پورا ہوا، اسلئے یکم دوشنبہ کو ہوئی،

مولوی اسد اللہ صاحب کا شغل قصبہ کول میں وکالت تھا، شعر گوئی کا اچھا ذوق رکھتے تھے مضطر تخلص تھا، معاصر شعرا کے کلام میں بھی دلچسپی لیتے تھے، چنانچہ ان کے مکان پر اکثر مشاعرے ہوا کرتے، اخیر عمر میں ضیق النفس کا عارضہ ہوگیا، جسکی وجہ سے وکالت چھوڑ کر خانہ نشینی اختیار کی، لیکن شعر گوئی کا ذوق اس قدر بڑھا ہوا تھا، کہ دوروں کی شدید تکلیف میں بھی یہ مشغلہ جاری رہتا، افسوس ہے کہ ان کے اشعار کا کوئی مجموعہ موجود نہیں، جو کچھ اشعار دستیاب ہوئے وہ درج ذیل ہیں، مولوی صاحب کا کلام اپنے زمانہ کی مروجہ روش کا پورا نمونہ ہے، زبان، محاورات اور بندشیں ہر ایک چیز اسکی شاہد ہے،

مخمس ناتمام

ہمیشہ رہتے تھے آپ ہم پرہ عنایت کر (لطف فرما)
کمی نہ ہم سے تھی بندگی میں نہ آپ سے تھا عتاب بیجا
یہ کیا غضب ہی خلاف عادت مزاج برہم ہوا (تمھارا)
چہ شد چہ کردم چہ دیدی از من چہ گفت باتو رقیب (رسوا)
چرا چنیں رنجہ گشتی از من کجا شد آن لطف آں مدارا

یہ بات دیکھی یہ پچھلا پہرا جہاں میں تیرگی ہی بیحد
اور آپ نکلے ہیں گھر سے باہر کہاں کو جاتے ہو کیا ہی (مقصد)
جو دیکھی ہم سے یہ بیچ ہو تو ہم کو تم سے گمان بد
ترا دریں تیرہ شب بخانہ برآمدن از سبب باشد
ہمہ ز رازِ تو آگہم من بہانہ دیگر مکن خدا را

غزل ناتمام

لے اڑی طرز فغاں بلبلِ نالاں ہم سے
گل نے سیکھی روشِ چاک گریباں ہم سے
لاکھ روکا نہ رکا دیدۂ گریاں ہم سے
لو ہوا چاہتا ہی نوح کا طوفان ہم سے
پاؤں پھیلائے تو ہی رہنا یہاں اے بلبل
چھوٹتا ہے کوئی دم میں یہ گلستان ہم سے

لہ یہ شتر گربہ ضرور ہے، مگر اس زمانہ کے اساتذہ اس سے گریز نہیں کرتے تھے، یہ ناتمام مخمس میں نے حضرت کی زبان سے سن کر لکھ لیا تھا لہ یہ غزل کسی نے مرزا غالب کو سنائی تھی، مرزا نے بہت پسند کی، اور پوچھا کس کی ہے، سنانے والے نے کہا کول میں ایک مولوی اسد اللہ ہیں، مرزا نے کہا، کیوں نہ ہو، یہ نام کا کمال ہے، (مرزا کا نام بھی اسد اللہ تھا) یہ واقعہ اور اوپر والے دو شعر مجکو حضرت نے سنائے تھے، تیسرا شعر لکھا ہوا ملا ہے،

غزل

جب تلک جلوہ نہ ہو اس غیرت پر چیں کا
کیا خوشی ہی عید کی گو چاند ہو انتیس کا
بیڑیاں مجکو پنھائیں اور تماشہ کے لئے
اوس نے دروازہ لگایا اپنا مقناطیس کا
میکدے میں جائیو بنت العنب کے خواستگار
دیکھ لو سب شیخ جی کا زہد تھا جبیں کا
خاکساری اور تکبر کا نتیجہ دیکھ لو،
کیا ہوا آدم کا انجام اور کیا ابلیس کا
خط ہمارا لے اڑا مرغِ سلیمان باندھ کر
جب ہوا تحریر نام اوس غیرت بلقیس کا
بل بے واشدنی ہماری طالعِ منکوس کی
نحس تھا ان بھی عمل کرتی ہی دیدان تکیس کا
کون کہتا ہے اساس زندگی قائم رہی (پر ہی)
قافیہ باندھو، نہ جس میں سرفہ ہو تاسیس کا
واہ سودا ہو تو ایسا ہو کہ مضطر اندنون
ہو رہا ہے مشتری اک غیرت برجیس کا

مسدس

افسوس ہم تو آپ پہ جی تک فدا کرین
اور آپ جا کے غیر کی برہیں ہا کرین
اب چاہیئے کہ ہم بھی نہ تم سے وفا کرین
پر یہ خیال آتا ہے ہر لحظہ کیا کرین
کفر است در طریقت ما کینہ داشتن
آئین ماست سینہ چو آئینہ داشتن

کہنے سے غیر کے ہوئے تم ہم پہ گر خفا،
اور چھوڑ التفات کو کرنے لگے جفا،
بہتر ہے اس سے اور زیادہ ہو بیوفا
ہے اپنا سینہ صورت آئینہ با صفا،

کفرست در طریقت ما کینہ داشتن
آئین ماست سینہ چو آئینہ داشتن

بہتر ہے آج غیر کی مجلس میں جائیں آپ — اور واں ہمارے قتل کا بیڑا اٹھائیں آپ
ہر چند لاکھ طرح سے ہم کو ستائیں آپ — پر دخل کیا جو بغض کی بو ہم سے پائیں آپ

کفرست در طریقت ما کینہ داشتن
آئین ماست سینہ چو آئینہ داشتن

اب تک جو میرے حال پہ تھی کم توجہی — واللہ تب بھی بندہ کو رنجش ذرا نہ تھی
اور اب جو مہربان ہوئے ہو یہی سہی — تب بھی یہی تھا قول مرا اب بھی ہے یہی

کفرست در طریقت ما کینہ داشتن
آئین ماست سینہ چو آئینہ داشتن

بھکا رہے ہیں تم کو جو اغیار بے حیا — تم جانتے ہو مجھ کو کہ یہ بھی ہوا خفا
کیا پوچھتے ہو پیارے کدورت کو دخل کیا — مضطر کی قبر سے بھی اُٹھے گی یہی صدا

کفراست در طریقت ما کینہ داشتن
آئین ماست سینہ چو آئینہ داشتن

خطِ منظوم

اٹھ قلم لکھ مرا یہ حال تباہ — جانب نور چشم لطف اللہ
کہ یہاں سے گئے ہو تم جب سے — چین مجکو ملا نہیں تب سے
وہی شدت مرض کی ہے تا حال — درد کا اشتداد ہے یکساں

درد ہے یا کہ اک قیامت ہے — درد ہے یا کہ جی کی آفت ہے
درد سے ایک پل نہیں آرام — درد سے ہے ہمارا کام تمام
بل بے اس درد کی جفا کاری — پہروں رہتی ہے بیخودی طاری
درد کے مارے جان جاتی ہے — بوٹی اک ایک تھرتھراتی ہے
رات دن درد سے ہے بے چینی — اب تو مشکل ہے سانس بھی لینی
درد کے مارے حال ہے ابتر — اس سے مرجاؤں میں تو ہو بہتر
رات بھر سر پٹکتے جاتی ہے — نیند آتی نہ موت آتی ہے
دن کو بھی پھر وہی ہے درد کا دور — جس نے پہنچا دیا ہے تا لب گور
گر یہی درد ہے تو مرتا ہوں — جان سے اپنی میں گذرتا ہوں
کاشکے درد میرا ٹل جائے — ورنہ بہتر ہے جی نکل جائے
سو یہ دونوں نظر نہیں آتے — اپنے حیراں ہیں غیر گھبراتے

خیر جو کچھ کہ مرضی مولیٰ
از ہمہ بہتر از ہمہ اولیٰ

تلخیص و تبصرہ

قدیم مشرقی طب

از جناب ڈاکٹر اسلم عمر صاحب،

اگست ۳۸ء کے انڈین میڈیکل گزٹ میں انگلستان کے ایک محقق طبیب اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں، کہ موجودہ تحقیق کے مطابق یونان اپنے طبی علوم کے لئے فینیشیا (ساحلی علاقۂ شام) بابل، سومیر اور مصر کا ممنون ہے، جہاں پانچ ہزار سال پیشتر تہذیب و تمدن اوجِ کمال پر تھے، وادیِ سندھ سے بھی یونان نے طب میں استفادہ کیا ہے، مصر نے تہذیب و تمدن کی تعلیم سُمرانیوں سے حاصل کی ہو، سومیر بابل کے دو حصوں میں سے ایک کا نام تھا، بابل و کلدانیہ میں آج سے چھ ہزار سال پیشتر تعلیم و تہذیب اعلیٰ درجہ پر تھی، یونانیوں کا عروج اسکے تین ہزار سال بعد ہوا، یعنی دنیا کے جس خطہ پر انسانی آبادی کی ابتدا ہوئی تھی، (جو تقریباً دس ہزار سال کے بعد آدمؑ کی دسوین پشت نوحؑ کے زمانہ میں ایک مرتبہ قریب قریب ختم بھی ہوگئی تھی، لیکن اسکی نشاۃ ثانیہ بھی پھر وہیں ہوئی) وہیں سے تہذیب و تمدن، تعلیم وغیرہ کا بھی آغاز ہوا، اور اسے اتنی ترقی کی، کہ ٹوائیلٹ یعنی سنگار کے موجودہ تکلفات بھی سمرانیوں میں موجود تھے،

اسلامی آرین نسل بحیرۂ خضر کے مشرق سے نکلی، اس کی ایک شاخ ایران و قاف میں آباد ہوئی اور دوسری جنوب و مشرق کی طرف حملہ آور ہو کر دریائے سندھ کے پورب میں قیام پذیر ہوئی، قدیم

ایرانی زبان ژند میں "س" اور "ہ" ایک دوسرے سے بدل جاسکتے ہیں، اس لئے یہ لوگ ہندو کہلائے

اس موقع پر ایک یہ بات قابلِ ذکر ہے، کہ یہ آرین نسل حضرت نوحؑ کے لڑکے یافث کے بڑے بیٹے ماجوج کی اولاد سے تھے، جو منگولیا میں آباد تھے، (ماجوج معرب ہے میگوگ کا، میگوگ منگول) یہ عجیب بات ہے، کہ تمام مذاہب اور تمام قدیم تہذیبیں عرض البلد درجہ ۳۵ کے آس پاس ظاہر ہوئین، آریوں کی ویدوں کو برھما نے پندرہ سو سال قبل مسیح لکھا، جنین سب بڑی اتھر وید ہے، اور امراض کو دور کرنے والے گنڈوں، منتروں تعویذوں کی کتاب ہے، پھر ایر وید کو لکھا، اور دھنونتری کو پیدا کیا، اس کا شاگرد سُسرت ایک بہت بڑا سرجن اور چرک بہت بڑا طبیب تھا، آنکھ کے موتیا کا سیتون والا علاج سُسرت ہی کی ایجاد ہے، وہ ڈوبگری (علم المقابلہ) کا بھی عالم اور جنین کی مختلف حالتون سے واقف تھا، اس نے حاملہ عورتوں کی موت کے بعد پیٹ چاک کرکے بچوں کو نکالا ہے، اگرچہ یہ آپریشن اس سے بھی قدیم زمانہ کا ہے، اُس کے زمانہ میں آپریشن روم "مخصوص ادویہ کے بخور سے معطر کیا جاتا تھا، سرجن کو سر اور چہرہ کے بال چھوٹے رکھنے پڑتے تھے، آپریشن کے وقت وہ بخور سے بسایا ہوا لباس پہنتا تھا، آپریشن سے پہلے مریض کو "سموہنی" سنگھائی جاتی تھی، چرک کی شان بقراط کی سی تھی، سب سے پہلے معدنی ادویہ سے اسی نے کام لیا، بھپارہ ضیق النفس کے لئے دھتورے کے سگریٹ، دانتوں کے لئے برش اور متعدد منجن اُس نے ایجاد کئے تھے، ہندوستان کے علم طب کا زوال برہمنوں کی تنگ دلی اور تنگ نظری سے ہوا، ان لوگوں نے اس علم کو بھی صرف اپنی قوم کے لئے مخصوص و محفوظ کرکے سرجری کو ممنوع کر دیا، اور علاج میں منتروں اور تعویذوں کو داخل کیا، سرجری کی بربادی میں رہی سہی کسر کو بدھ مت نے پورا کر دیا، لیکن انھون نے طب کی دوسری شاخ کی بڑی آبیاری کی، حفظانِ صحت پر خاص توجہ کی، انسانوں اور جانوروں کے لئے اسپتال قائم کئے، شاہراہوں

پر ہر دس موضوں کے لئے ایک طبیب و دواخانہ کا اہتمام تھا، اشیاے خورد و نوش میں آمیزش کو جرم قرار دیا، جڑی بوٹی کے باغات لگائے،

یونان کی طب کو جب شمالی حملہ آوروں نے اس کی تمام دوسری اچھی چیزوں کے ساتھ برباد کر دیا، تو قدرت کی مرضی سے یہ گہوارہ ایک مرتبہ پھر مصر و شام مین قائم ہوا، اندلس کے اسلامی دور مین قرطبہ نے کتنے مشہور طبیب پیدا کئے، الزہراوی، ابن زہر (Albne-Baja) کا کیا مرتبہ تھا،

خلفاے عباسیہ کی توجہ نے اس زمین کو آسمان تک پہنچا دیا، رازی، علی عباس، اور ابن سینا اس دور کے آسمان طب کے درخشان ستارے تھے، ابن سینا کی ذات دسوین سے پندرہوین صدی تک کے دور مین عدیم النظیر تھی، جو بقراط کے بعد سب سے بڑا درجہ رکھتی ہے، عربوں نے مغرب کو ایک ہزار سال تک طب و دیگر علوم میں درس دیا ہے،

سعودی حکومت مین تعلیم کی رفتار

ہفتہ وار اخبار المدینۃ المنورہ نے وزیر تعلیم کی اطلاع کی بنا پر لکھا ہے، کہ حجاز میں سرکاری مدرسوں کی تعداد ۴۶ ہے، جن میں پانچہزار سے زیادہ طلبہ تعلیم پاتے ہیں، غیر سرکاری درسگاہین ۱۰ ہیں، جن میں پڑھنے والوں کی تعداد تین ہزار نو سو ستر سے زیادہ ہے، جدہ، مدینہ، طائف، اور ینبع کے سوا باقی تمام ملحق مدرسون میں شروع سے پانچ سال تک کی تعلیم دی جاتی ہے، تمام ابتدائی اور ثانوی مدرسوں میں دینی علوم کے ساتھ جدید علوم بھی اسی طریقہ پر پڑھائے جاتے ہیں جس طریقہ پر تمام ترقی یافتہ ملکوں میں پڑھایا جاتا ہے، حکومت عربوں سے جہالت کو دور کرنے کیلئے فوقانی تعلیم کو پھیلانے کی پوری جدوجہد کر رہی ہے،

سرکاری مدرسے پایۂ تخت مین اس قسم کے بارہ مدرسے ہیں، (۱) مدرسہ تحضیر البعثات، (۲) معہد علمی سعودی، (۳) مدرسہ عزیزیہ ابتدائی، (۴) مدرسہ عزیزیہ فوقانی (۵) مدرسہ سعودیہ ابتدائی (۶) مدرسہ سعودیہ فوقانی، (۷) مدرسہ فیصلیہ ابتدائی (۸) مدرسہ فیصلیہ فوقانی (۹) مدرسہ رحمانیہ ابتدائی، (۱۰) مدرسۂ رحمانیہ فوقانی، (۱۱) مدرسہ محمدیہ فوقانی، (۱۲) مدرسہ خالدیہ فوقانی،

ان سے ملحق مدرسے کل ۴۴ ہیں، جن کی تفصیل یہ ہے، جدہ میں تین، دو فوقانی اور ایک ابتدائی، مدینہ مین تین، دو فوقانی اور ایک ابتدائی، طائف میں دو، ایک فوقانی اور ایک ابتدائی ینبع میں دو، ایک فوقانی دوسرا ابتدائی، وجہ، ضبا، املج، علاء، تبوک، قنفذہ، جیزان، ینبع النخل، ابہا، صبیا، ابی عریش، بیشہ، ظفیر، درانغ میں ایک ایک فوقانی مدرسہ، نجد اور احسا میں نو مدرسے ہیں، جو کل کے کل فوقانی ہیں،

غیر سرکاری مدرسے مدینہ میں اس قسم کے آٹھ مدرسے ہیں، جن کے نام یہ ہیں، (۱) مدرسۃ العلوم الشرعیہ (۲) دار الایتام (۳) مدرسۃ النجاح (۴) مدرسۃ التربیۃ والتعلیم (۵) مدرسۃ الخیریہ، (۶) دار الحدیث (۷) مدرسۃ التہذیب، (۸) مدرسۃ القرأۃ والتجوید، ان مدرسوں میں نو سو سے زیادہ طلبہ تعلیم پاتے ہین،

مکہ میں دس مدرسے ہیں، جن کی تفصیل یہ ہے:-

۱- مدرسۃ **الفلاح**، یہاں ابتدائی ثانوی، فوقانی تینوں طرح کی تعلیم ہوتی ہے، طلبہ کی تعداد چھ سو سے زیادہ ہے،

۲- مدرسۂ **صولتیہ**، یہان بھی تینوں طرح کی تعلیم ہوتی ہے، اور طلبہ کی تعداد چھ سو سے زیادہ ہے،

۳- مدرسۃ **الفخریہ**، یہان صرف ابتدائی اور فوقانی تعلیم ہوتی ہے، اور طلبہ کی تعداد

چار سو سے کچھ زیادہ ہے،

۴۔ **مدرسۃ الترقی** یہاں بھی صرف ابتدائی اور فوقانی تعلیم ہوتی ہے، مگر طلبہ کی تعداد ایک سو بیس سے کچھ زیادہ ہے،

۵۔ **مدرسۃ الفائزین**، صرف فوقانی تعلیم ہوتی ہے، اور طلبہ کی تعداد دو سو سے کچھ اوپر ہے،

۶۔ **مدرسۃ العلوم الدینیہ**، تعلیم فوقانی اور ابتدائی ہے، اور پانچسو سے کچھ زیادہ طلبہ تعلیم پاتے ہیں،

۷۔ **مدرسۃ النجاح**، ۸۔ **مدرسۃ التعاون** } یہ دونوں شبینہ مدرسے ہیں، جو ان پڑھ لوگوں کی تعلیم کے لئے قائم کئے گئے ہیں، پہلے کی تعداد سو اور دوسرے کی پچاس ہے،

۹۔ **مدرسۃ الماحی**، تعلیم فوقانی ہے، اور طلبہ کی تعداد سو ہے،

۱۰۔ **مدرسۃ الفلاح**، یہ مدرسہ جدہ میں ہے، ابتدائی، ثانوی، فوقانی، تینوں طرح کی تعلیم ہوتی ہے، اور طلبہ کی تعداد چار سو ہے،

"س"

معارف: اوپر جن غیر سرکاری مدرسوں کے نام لئے گئے ہیں، ان میں ایک خاص لحاظ سے قابل ذکر مکہ معظمہ کا مدرسہ صولتیہ اور مدرسہ فخریہ اور مدینہ منورہ کا مدرسہ شرعیہ ہے، یہ وہ مدرسے ہیں، جو ہندوستانی مسلمانوں کے چندوں سے قائم ہیں، اور اس سرزمین اقدس میں علم دین کی بڑی خدمت کر رہے ہیں، مدرسہ صولتیہ پرانا مدرسہ ہے، جو بنگال کی صولت النساء بیگم کی یادگار اور مولینا رحمۃ اللہ صاحب کیرانوی کی ذات بابرکات کا فیض ہے، اور مدرسہ شرعیہ مدینہ منورہ میں شریف حسین کے آخر زمانہ میں مولینا سید احمد صاحب فیض آبادی کی مخلصانہ سعی و کوشش کا نتیجہ ہے، اور بہت کچھ ہماری اعانتوں کا محتاج ہے، صولتیہ اور مدرسہ شرعیہ کی پختہ سنگی عمارتیں ہیں،

موجودہ تمدن کے آثار کی حفاظت کا انتظام

جارجیا کے سائنس دانوں کے سامنے آج کل ایک دلچسپ مسئلہ زیر غور ہے، وہ یہ کہ فرض کیجئے کہ ۸۱۱۳ء کا زمانہ ہے، اس وقت تک ظاہر ہے کہ بیسویں صدی کے تمام تہذیب نیست و نابود ہو جائینگے، موٹر کار، ریل گاڑی، اور ہوائی جہاز کے موجودہ کل پرزوں کا پتہ نہ رہے گا، آلات، اوزار، ظروف، کتب، رسائل اور اخبارات جو اس وقت موجود ہیں، ان کا نشان باقی نہ ہوگا، موجودہ انسانی معلومات کے تمام ذخیرے معدوم ہو جائیں گے، اس خیال کے پیش نظر جارجیا کے ماہرین آثار قدیمہ اور سائنسدانوں کی یہ کوشش ہے کہ کوئی ایسی تدبیر اختیار کی جائے، کہ ۱۹۳۶ء کے علم و تمدن کی چیزیں اس زمانہ میں بالکل صحیح و سالم اور مکمل ملیں، اس غرض کے حصول کے لئے اوگل تھورپ یونیورسٹی (جارجیا) میں ایک زمین دوز پتھر کا کمرہ بنایا گیا ہے، جس کی دیواریں کرومیم کی بنائی گئی ہیں، اس کمرہ میں انسائیکلوپیڈیا، اسکول اور کالج کے نصاب کی کتابیں، ادب و تاریخ کے شاہکار، فلسفہ کے افکار عالیہ، سائنس کے تجربے، صنعت و حرفت کے نمونے، انجینرنگ کے کمالات، سینما کے فلم، اور صنعتی مشینیں وغیرہ وغیرہ رکھدی جائیں گی، تاکہ ۸۱۱۳ء کے مورخوں کو ۱۹۳۶ء کے تمدن کا صحیح اندازہ ہو، ان چیزوں کو محفوظ کرنے کے بعد کمرہ کو نائٹروجن گیس سے بھر کر بند کر دیا جائے گا،

ان میں سے بعض چیزیں عجیب و غریب طریقہ سے رکھی جائیں گی، مثلاً کتابوں کے نسخے لوہے، تانبے اور نکل کے فلم پر اتار لئے جائیں گے، اور ان پر پلاٹینم کی تہ لگادی جائے گی جس سے وہ خراب ہونے سے بالکل محفوظ ہو جائیں گے، سینما کے فلم شیشے کی ایک نلکی میں

بند کردیجائینگے جنمیں گیس بھری ہوگی، یہ شیشے کی نلکی ہزاروں من کے بوجھ سے دب کر بھی نہ ٹوٹ سکے گی، ممکن ہے اس وقت تک انگریزی زبان انقلابات عالم کے سبب سے بھلا دیجائے، اسلئے اس زبان کی یاد تازہ کرنے کے لئے ایک فلم پر انگریزی حروف لکھدیئے جائیں گے، اور اسی کے ساتھ ایک فونوگراف منسلک کر دیا جائے گا، تاکہ اس کے ذریعہ سے لوگ انگریزی الفاظ کے تلفظ معلوم کرسکیں،

ممکن ہے کہ اتنی مدت کے بعد اس دفینہ کی صحیح جگہ کا پتہ چلانا مشکل ہوجائے، اس لئے اس مقام کی تفصیلات دنیا کے تمام بڑے بڑے کتب خانوں اور عجائب خانوں میں محفوظ کردی جائینگی، چین، تبت اور ہندوستان کی خانقاہوں اور پرستش گاہوں میں بھی اس کی تفصیلات موجود رہیں گی، تاکہ لوگ اگر واقعی اس دفینہ کو بھول جائیں، تو دنیا کے کسی ایک گوشہ سے بھی اسکی جائے وقوع معلوم ہوسکے، "ص ع"

لغاتِ جدیدہ

عربی زبان کے اخبارات رسائل تصنیفات اور بول چال میں ہزاروں نئے الفاظ پیدا ہوگئے ہیں، جنکے بغیر آج کل کی عربی زبان سمجھنا دشوار ہے، مصنف نے اس کتاب میں اس قسم کے چار ہزار جدید عربی الفاظ کا لغت لکھا ہی، مع اضافہ وضمیمہ مسعود عالم ندوی اڈیٹر "الضیا" طبع سوم قیمت ۱۲؍

خطباتِ مدراس

مولینا سید سلیمان ندوی نے ۱۹۲۶ء میں مدراس مین سیرت نبوی کے مختلف پہلوؤں پر آٹھ خطبے (لکچرز) دئے تھے، جو نہایت مقبول ہوئے، اور مسلمانوں نے انکو بیحد پسند کیا، ۱۸۰ صفحے قیمت ۱۲؍

"منیجر"

اخبارِ علمیہ

بوس انسٹیٹیوٹ کے کارنامے

سر جے سی بوس ریسرچ انسٹیٹیوٹ کے اکیسویں سالِ تاسیس کے جلسہ میں جو اسی مہینہ کلکتہ میں منعقد ہوا ہے، انسٹیٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ام ڈی بوس نے اس کے کارناموں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اب تک اس ادارہ میں تحقیقات اس کے بانی ہی کے بتائے ہوئے اصولوں پر ہوتی رہی ہیں یعنی زندگی کے مظاہر کا مطالعہ طبیعیاتی کیمیا کی جدید ترین تحقیقات کی روشنی میں کیا جاتا ہے، اور اس کے نتائج کی عملی تطبیق زراعت اور طب کیساتھ کیجاتی ہے، پودوں کے عضویات کا مطالعہ بھی حسب معمول جاری ہے، اور اس سلسلہ میں وہی آلات استعمال کئے جاتے ہین، جو اس ادارہ میں تیار کئے گئے ہیں، ان آلات سے بھی مدد لیجاتی ہے، جو پودون کے عضویات کے ماہرین نے وقتاً فوقتاً ایجاد کئے ہیں، ایک نیا کام یہ شروع کیا گیا ہے، کہ پودون کے ہارمون کے اثرات ان کے نشوونما پر کیا ہوتے ہیں، (ہارمون وہ اندرونی افراز ہے، جو خون میں مل کر تحریک اعضاء کا باعث ہوتا ہے،) اس سلسلہ میں بعض دلچسپ معلومات حاصل ہوچکے ہین،

زراعتی مسائل کی بھی تحقیقات جاری ہے، چنانچہ گذشتہ چند سال کے اندر مختلف غذاؤں کی قوتِ نمو اور حیاتین سے متعلق بہت سی مفید باتین معلوم ہوئی ہیں، اس سال مٹی کی مختلف قسمون

کے حیاتیات جرثومی (Microbiology) پر بھی کام شروع کیا گیا ہے، علم الحیوانات کے شعبہ میں مختلف قسم کے مکڑوں اور چیونٹیوں کے عادات و خصائل پر مشاہدات ہوئے ہیں، بنگال کی مچھلیوں کی تاریخ اور انکی خصوصیات پر بھی مطالعہ جاری ہے، مچھلیوں کی نسلیں تیار کرنے کیلئے فانا کے بہت سے تالاب مصرف میں لائے جا رہے ہین، اگر ممکن ہوا تو بڑے بڑے دریا کی مچھلیون کا مطالعہ بھی جلد شروع کیا جائے گا،

علم الانسانیات کا بھی ایک چھوٹا سا شعبہ ہے، جہان خون کی تحقیقات کا سلسلہ جاری ہے، اس شعبہ کے ایک رکن کو اس موضوع پر تحقیق کرنے کے لئے جرمنی سے ایک وظیفہ ملا ہے، چنانچہ وہ آج کل برلن میں پروفیسر ابوجن فشر کے معمل میں اس تحقیق میں مصروف ہے،

ترکی زبان کی رفتارِ تجدید

گذشتہ چند سال کے اندر ترکی زبان مین جو انقلاب پیدا ہوا ہے، وہ اس ملک کی کلچرل فتح و کامرانی کا ایک بہت بڑا ثبوت" بتایا جاتا ہے، اب سے چھ سال پہلے مصطفےٰ کمال نے زبان کو صاف اور پاکیزہ بنانے کا عزم کیا، اس وقت سے اب تک برابر اسکی کوششیں جاری ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہے، کہ قومی کلچر کے دو ستون یعنی زبان اور تاریخ غیر ملکی عناصر کی آلائشون سے بالکل صاف ہو گئے ہیں، یونیورسٹی کے اساتذہ کی تحقیقات سے ترکی زبان کی بہت قدیم مخفی دولت کا انکشاف ہوا ہے، اور وہاں کے ماہرینِ لسانیات کا دعویٰ ہے، کہ یہ دنیا کی تمام کلچرل زبانون کی ماں ہے،

زبان کے تمام اصلی اور ملکی الفاظ کی تلاش اور جستجو جاری ہے، غیر ملکی الفاظ خارج کئے جا رہے ہین، الفاظ کے تصنع اور نامناسب استعمال کو دور کیا جا رہا ہی، تحریر اور بول چال کی زبان کے فرق

کو مٹایا جا رہا ہے، اسکول اور کالج کی کتابوں میں وہی اصطلاحات استعمال کیجاتی ہیں، جو خالصۃً قومی اور ملکی ہیں، گذشتہ سال ریاضی، طبعیات، کیمیا، صنعت و حرفت، علم الحیات، علم الحیوانات اور معدنیات کے لئے چار ہزار اصطلاحات وضع کر کے کالجوں میں رائج کی گئی ہیں، امید کیجاتی ہے کہ آیندہ سال سائنس کی تمام اصطلاحات خالص ترکی زبان میں وضع کر لیجائیں گی، ایک ترکی ماہر زبان نے کہا ہی، کہ ہم اپنی زبان کی تاریخ میں صرف وہی چیز تلاش کرتے ہیں، جو ہماری ہے، اور ہم کو اس کا احساس ہے کہ ترکی قومی زبان ہماری قوم کی تاریخ کا ایک غیر فانی نقش ہے"،

کائناتی شعاعوں کا مطالعہ

واشنگٹن کے ماہرین طبعیات مسلسل چار مہینے سے اوپر ہوا کی بلندی میں غبارے بھیج رہے ہین تاکہ کائناتی شعاعوں سے متعلق معلومات حاصل کر سکین، غباروں میں باذنگار (Bazzog zaph) اور خود سے آواز دینے والا ریڈیو منسلک کر دیتے ہیں، جس سے ہر پندرہ سکنڈ پر آواز آتی رہتی ہو اس آواز سے کائنات کی بلندی اور سختی کا اندازہ ہوتا ہی، چھ غبارے بہ یک وقت ۲۳ میل تک (۱۲۰،۰۰۰ فٹ) اوپر گئے اب تک ان سے اونچا کوئی اور غبارہ نہین جا سکا ہے، زیادہ سے زیادہ ۹۲،۰۰۰ فیٹ اوپر تک غبارے جا سکے ہین،

اس تحقیقات سے یہ پتہ چلا ہے، کہ ۱۲ میل اوپر کائنات کی شعاعین و یز ہوتی ہین، اور اسکی سختی سمندر کی سطح کی سختی سے ۲۰۰ زیادہ ہوتی ہے، بارہ میل اوپر ابتدائی شعاعیں ہوا کے سالمے سے متصادم ہو کر ثانوی شعاعوں سے ملجاتی ہین، اس کے اوپر ہوا کی دبازت اس قدر کم ہو جاتی ہے کہ ثانوی شعاعین اس سے علحدہ ہو جاتی ہیں، بارھوین میل سے نیچے ہوا کی دبازت کم ہوتی جاتی ہو کیونکہ ابتدائی شعاعین فضا کی مقاومت میں جذب ہوتی رہتی ہین،

"ص، ع"

ادبیات

ماتمِ کمال

از یحییٰ اعظمی

اے ترک اے مجاہدِ اسلام اے کمال
ماتم میں سرنگوں ہے ترے پرچم ہلال

مرنا ترا قیامتِ کبریٰ سے کم نہیں
لیکن عرب سے تا بہ عجم غم سے ہے نڈھال

سارے جہاں میں ہے صفِ ماتم بچھی ہوئی
سب کو کمال غم ہے کہ یہ ہے "غم کمال"

ہستی تری تھی شرق کی وہ تیغِ آبدار
حملوں سے جس کے عرصۂ مغرب تھا پائمال

بازو ترے تھے حاملِ سیفِ ید اللّٰہی
زندہ تھی تجھ سے خالد جانباز کی مثال

دی جس میں شاطرانِ زمانہ کو تو نے مات
دنیا کو یاد ہے وہ تری بازیٔ قتال

پرشور تجھ سے مشرق و مغرب کی وادیاں
پہنچا تھا چار سو ترا آوازۂ جلال

کھینچا ہے تیری تیغ نے جو نقشِ زندگی
اس کو مٹا سکے یہ زمانہ کی کیا مجال

وہ قوم جس پہ ملتِ مردہ کا تھا گماں
بخشی ترے نفس نے اسے روحِ لازوال

اللہ ری بہار کی معجز نمائیاں
اجڑے چمن کو از سرِ نو کر دیا نہال

سچ یہ ہے تیرے عہد نے پھر تازہ کر دیا
ترکوں کی سلطنت کی جوانی کا وہ جمال

اے غازیِ یگانۂ دیں اے فقیدِ شرق
دیکھے گی اب نہ چشمِ زمانہ تری مثال

قطعۂ تاریخِ وفات مصطفےٰ کمال پاشا اتاترک مرحوم صدر جمہوریہ ٹرکی

از مولینا ابو المآثر حبیب الرحمن صاحب اعظمی مدرس اعلیٰ مدرسۂ مفتاح العلوم، مئو

مرحوم مصطفےٰ کمال پاشا اتاترک کی وفات کی تاریخیں اخباروں میں بہت سی چھپی ہیں، اور چھپیں گی، مگر جیسا ذیل قطعہ اپنی جگہ پر خاص حیثیت رکھتا ہے۔

"معارف"

صدرِ جمہوریۂ سلطنت ترکیہ،
کہ درین دور بس بود ز اعیانِ رجال

آخرِ غمزدہ، تاریخِ وفاتش می جست
آمد از غیب ندا، "مرد اتاترک کمال"

سنہ ۱۳۵۷ھ

فضائے عرفانی

از مرزا عزیز فیضانی

پیرِ میخانہ کو ہے کام سے کام اے ساقی
بزمِ رندان کا ہے اب کام تمام اے ساقی

میکدہ کا ہے پراگندہ نظام اے ساقی
صفِ رندان کا نہیں کوئی امام اے ساقی

بندۂ حق ہے زمانہ کا غلام اے ساقی
بھول بیٹھا ہے وہ خود اپنا مقام اے ساقی

عشق کی خیر عجب حال ہے اب کیا کہئے!
دل ہے سینے میں کہ بے بادہ ہے جام اے ساقی

وقت آیا ہے کہ پینا تو رہا ایک طرف
ہو گیا مست پہ جینا بھی حرام اے ساقی

کچھ غرض کیف سے ہے مجھکو نہ جامِ مے سے
میکدے میں ہے مجھے تجھ سے ہی کام اے ساقی

جلوہ دکھلا کہ بجھایا ہے چراغِ دل کو
اس زمانہ کی ہوا نے سرِ شام اے ساقی

مدعی یوں تو ہیں محفل میں ہزاروں تجھ بن
یہ مگر اور کسی کا نہیں کام اے ساقی

خود فراموشی و خاموشی و راحت کوشی
یہی رندی ہے تو رندی کو سلام اے ساقی

وہ پلا جس میں ہو مستی کے عوض جوشِ عمل
شورِ قلقل بھی عمل کا ہو پیام اے ساقی

باب التقریظ والانتقاد

فہرست مخطوطات عربی جلد دوم

کتبخانہ انڈیا آفس لندن

انڈیا آفس لندن کی قلمی عربی کتابوں کی یہ دوسری جلد ۱۹۳۶ء میں چھپ کر نکلی ہے، اسمیں صرف اخلاق اور تصوف کی کتابوں کا ذکر ہے، بڑے سائز کے سو صفحوں میں ص ۹ سے شروع ہو کر صفحہ ۱۹۵ پر ختم ہوئی ہے، نمبر ۱۲۱ سے شروع ہوتی ہے، اور نمبر ۱۴۲۱ پر ختم ہوتی ہے یعنی اس میں تصوف و اخلاق کی ۳۰۰ کتابوں اور رسالوں کا بیان ہے، اس ذخیرہ کا بڑا حصہ ہندوستان سے گیا ہوا معلوم ہوتا ہے، ان کتابوں اور رسالوں میں حضرت شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کی تصنیفات کی تعداد بہت اچھی خاصی ہے، ہندوستان کے صوفیوں کی لکھی ہوئی چند کتابیں ہیں خصوصاً شیخ وجیہ الدین گجراتی، مخدوم مہائمی اور شیخ محب اللہ الہ آبادی کی ایک کتاب پھلواری (بہار) کے ایک بزرگ مولینا امراللہ کی بھی ہے جو بارہویں صدی ہجری میں تھے،

اس فہرست کے مؤلف کتبخانہ مذکور کے نائب ناظم مسٹر اے جے، آربری ایم اے (A. J. Arberry) ہیں موصوف نے یہ فہرست محنت اور کوشش سے تیار کی ہے، نامعلوم مصنفون کی تلاش اور کتابوں کی تحقیق میں پوری جد وجہد کی ہے، اور پیش نظر معلومات سے ہر طرح فائدہ اٹھایا ہے، اس فہرست میں بعض نایاب کتابوں اور رسالوں کے نام ملتے ہیں، ابن تیمیہ کا ایک رسالہ

"قرب العبد الی الرب و قرب الرب الی العبد" ہے جسمیں اس مشکل کو حل کیا ہے کہ "استوا علی العرش" کے ساتھ قرب عبد کی گتھی کیسے سلجھ سکتی ہے، یہ رسالہ چھپا نہیں اور نہ کسی اور کتبخانہ کی فہرست میں نظر آتا ہے، شیخ اکبر کے جو رسائل اسمیں ہیں انکی فہرست یہ ہے،

۱- العبادلہ 1263 (نمبر کتبخانہ) (۲) ایام الشان 1262 (۳) الامر المحکم المربوط فیما یلزم اہل طریق اللہ من الشروط (۴) عنقاء مغرب فی معرفۃ ختم الاولیاء و شمس المغرب 1264 (۵) اسرار الخلوۃ 1266 (۶) الانوار فی المشاہدہ 1269 (۷) فی الازل 1270 (۸) فیما لا یعول علیہ فیما یعول علیہ 1271 (۹) فصوص الحکم فی خصوص الکلم 1272 (۱۰) النصف الاول من الفتوحات المکیۃ 1280 (۱۱) حلیۃ الابدال 1289 (۱۲) الاعلام باشارات اہل الالہام 1290 (۱۳) انشاء الدوائر 1291 (۱۴) الاسرا الی مقام الاسرار 1292 (۱۵) الجلال والجمال 1293 (۱۶) رسالہ کنہ ما لابد منہ 1294 (۱۷) ماہیۃ القلب 1295 (۱۸) مقام القربۃ 1296 (۱۹) المعرفۃ 1297 (۲۰) مواقع النجوم 1298 (۲۱) المیم والواو والنون 1299 (۲۲) نسبۃ الخرقۃ 1300 (۲۳) الرسالۃ البرزخیہ 1301 (۲۴) رسالۃ الغوثیہ 1302 (۲۵) اسرار الشجرۃ النعمانیہ 1305 (۲۶) شفاء العلیل 1310 (۲۷) شجون المشجون 1311 (۲۸) التدبیرات الالہیۃ 1313 (۲۹) تذکرۃ الخواص و عقیدۃ اہل الاختصاص 1314 (۳۰) التجلیات الالہیہ 1316 (۳۱) عقلۃ المستوفز 1317 (۳۲) وصیۃ 1318 (۳۳) الیاء وہو کتاب الھو 1319 (۳۴) کتاب نامعلوم الاسم 1320 (۳۵) لطائف الاعلام فی اشارات اہل الالہام 1321،

نمبر ۲۷ پر جو رسالہ شجون المشجون نام کا ہے، اسمیں تین کتابوں کے حوالے آئے ہیں الملخص مظفر بن سنان فی الرد علی الفلاسفہ، رسائل اخوان الصفا، اور املا شیخ علاء الدین الوراق، پہلے سے کتاب الرد علی الفلاسفہ کی فہرست میں ایک نئے نام کا اضافہ ہوا، دوسرے یہ معلوم ہوا کہ شیخ کے مطالعہ میں رسائل اخوان الصفا رہے ہیں، اسکا نسخہ آصفیہ میں بھی ہے،

شیخ وجیہ الدین گجراتی کی الحقیقۃ المحمدیہ کی ایک شرح الافاضات الاحمدیہ فی شرح الحقیقۃ المحمدیہ ہے، آربری صاحب کا خیال ہے کہ یہ کتاب کسی اور کتب خانہ کی فہرست میں درج نہیں، حالانکہ یہ کتبخانہ آصفیہ کی فہرست میں درج ہے، (جلد اول صفحہ ۳۶۶ نمبر ۹۵ تصوف عربی) کتاب میں اسکے مصنف کا نام محمد دائم بن سید مرزا ابن کریم اللہ الحسینی ہے،

آربری صاحب کو اس سے زیادہ معلوم نہ ہو سکا، مگر کتب خانہ آصفیہ کی فہرست میں بتایا گیا ہے، کہ یہ مانڈو کے رہنے والے تھے، جو ہندوستان میں صوبہ مالوہ کا مشہور شہر تھا،

صفہ ۱۹۱ پر شیخ حسن محمد بن میانجیو کے دو رسالوں کا ذکر ہے ایک من عرف اللّٰہ کل لسانہ اور دوسرا رسالہ فی بیان الجہاد الاکبر شیخ حسن محمد بن میانجیو بن شیخ نصیر الدین بن شیخ سراج الدین بن علامہ کمال الدین مرید شیخ جمال الدین مشہور بہ شیخ جمن کے تھے اور وہ شیخ محمود مشہور بہ شیخ راجن کے، اور وہ شیخ علم الدین کے اور وہ حضرت شیخ محمود نصیر الدین چراغ دہلی اودھی، متوفی ۷۵۷ھ کے تھے، شیخ حسن محمد نے ۹۸۲ھ میں وفات پائی، احمد آباد میں مزار ہے، (خزینۃ الاصفیا ص ۴۳۶)

پہلے رسالہ میں جس کا آغاز مؤلف فہرست نے نقل کیا ہے یہ عبارت ہے، فیقول العبد..... محمد بن قطب الاولیاء شیخ الاتقیاء..... محمد بن نصر المعروف بشیخ حسن بن محمد بن میانجیو.....المستفیض المستفیض ظاہراً و باطناً من شیخہ وخالہ الشیخ نصر الحق والدین محمود الاودھی چراغ دہلی .....انی کنت عند شیخی رضی اللّٰہ عنہ،

مؤلف فہرست کی عبارت میں کئی سقم ہیں، ایک تو نصیر کو اصل عربی اور انگریزی دونوں میں نصر لکھا اور نقل کیا ہے، دوسرے یہ کہ شیخ حسن کو حضرت نصیر الدین محمود چراغ دہلی کا مرید عربی کی عبارت بالا سے سمجھا اور لکھا ہے، حالانکہ ان دونوں کے زمانوں میں صدیوں کا فصل ہے "المستفیض" صفت اس آخری نام کی ہوگی، جہاں نقطے دیئے گئے ہیں، نہ کہ شیخ حسن کی، وہ نام غالباً علامہ کمال الدین کا ہے، جو حضرت نصیر چراغ دہلی کے بھانجے اور مرید تھے، ۷۵۶ھ میں وفات پائی، (خزینۃ الاصفیا ص ۳۵۳) جسکی تائید اس رسالہ کے دیباچۂ مذکور سے بھی ہوتی ہے، مؤلف فہرست نے ہلورٹ (AHLWARDT) سے شیخ حسن کا زمانہ ۱۰۰۱ھ نقل کیا ہے، اور بروکلمن نے ۱۱۰۱ھ اور صحیح طور سے بروکلمن کے بیان کو اس لئے غلط کہا گیا ہے، کہ شیخ حسن کا دوسرا رسالہ

جو کتب خانہ میں موجود ہے، ۱۱۲۰ھ کا نقل کیا ہوا ہے، ہمارے بیان سے معلوم ہو چکا، کہ شیخ حسن کی وفات ۹۸۲ھ میں ہوئی ہے،

فہرست کے نمبر ۱۴۱۴ و نمبر ۱۴۱۵ کے بیان میں ایک تعجب انگیز غلطی ہے، نمبر ۱۴۱۴ الارشاد فی سلوک الطریق والوصول الی علم السداد کے مصنف کا نام و نشان اس کے بالائی صفحہ پر شاہ عبد الرسول انبالوی لکھا ہوا ہے، مؤلف فہرست نے اس کو نمبر ۱۴۱۵ "تبصرہ" نام کتاب کے مصنف عبد الرسول بن محمد خان البیجاپوری سے مطابق کیا ہے، اور دونوں کو ایک بتانا چاہا ہے، حالانکہ ایک کا وطن انبالہ صوبہ پنجاب ہے، اور دوسرا اپنا وطن بیجاپور دکن (بمبئی) بتاتا ہے، ان دونوں کے بیچ میں ہزار میل کے قریب کا فصل ہے،

نمبر ۱۴۳۳ ایک کتاب تحلیل معضلات ابن العربی کا نام ہے، اس کے مصنف کا نام امر اللّٰہ بن منیر اللّٰہ محمد الطیار[1] بطناً پھلواروی البہاری وطناً ہے، بہاری کو جو صوبہ بہار (بالکسر) کی طرف منسوب ہے، مؤلف فہرست نے بہاری (بالفتح) Baharee پڑھا اور لکھا ہے، جو ظاہر ہے کہ صحیح نہیں، پھلواری صوبہ بہار کا مشہور علمی و مذہبی قصبہ ہے، جہاں کی خاک سے بہت سے اہل فضل اور اہل دل اٹھے ہیں، ملا امر اللّٰہ بن منیر اللّٰہ حضرات سجادہ نشینان خانقاہ مجیبی پھلواری کے مورث اعلیٰ حضرت تاج العارفین مولانا مجیب اللّٰہ المتوفی ۱۱۹۱ھ کے چچازاد بھائی تھے، دہلی میں تعلیم پائی، وہیں رہے، وہیں ۲۰ محرم ۱۱۳۸ھ میں وفات پائی، شاہ ولی اللّٰہ صاحب کے والد بزرگوار شاہ عبد الرحیم صاحب کے معاصر تھے، شاہ عبد الرحیم صاحب نے اپنے ملفوظات میں ان کا ذکر کیا ہے،

"س"

[1] جعفر طیار رضی اللّٰہ عنہ کی طرف نسبت، س

مطبوعاتِ جدیدہ

اسلام اور موجودہ تمدنی مسائل، از مولینا ابو البرکات عبد الرؤف صاحب دانا پوری تقطیع بڑی، ضخامت ۰۰ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت :- ۸ر

پتہ :- مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی،

مولینا نے عنوانِ بالا سے جامعہ ملیہ میں ایک توسیعی خطبہ دیا تھا، جس میں اسلامی عقائد، عبادات، معاملات اور دوسری اسلامی تعلیمات پر متکلمانہ تبصرہ کرکے دکھایا ہے، کہ موجودہ تمدنی نظام کے مقابلہ میں ان کا کیا درجہ ہے، اس میں ایک اصولی بحث یہ کی گئی ہے، کہ انسانی عقل اور عقلی علوم جن کو انکشاف حقائق کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے، وہ خود ناقص ہیں، اور ان کے نتائج کی صحت یقینی نہیں ہے، اور وہ باہم مختلف اور متناقض ہوتے ہیں، پھر انسانی عقلیں باہم متفاوت ہیں، اور ان کا ادراک محسوسات و مادیات تک محدود ہے، وہ مذہب کی مابعد الطبیعی تعلیمات اور روحانی حقائق کا ادراک نہیں کر سکتیں، اسلئے مذہبی حقائق میں انہیں معیار نہیں بنایا جاسکتا، اس کے رمز شناس صرف انبیاء علیہم السلام ہیں، انکی تعلیمات کے ادراک وعرفان کا وسیلہ روحانی قویٰ اور ایمان کا ذوق و وجدان ہے، معجزہ دلیل نبوت ہے، اس میں کوئی عقلی استحالہ نہیں، غیر نبی سے خرقِ عادت کا ظہور نہیں ہو سکتا، شعبدہ صرف بازیگری ہے، اسکے بعد مطلق مذہب کے بنیادی اصولوں اور تعلیمات اور ان کے فلسفہ کو پیش کرکے ان کے احکام وعبادات کے اختلاف کے اسباب کو ظاہر کیا گیا ہے، پھر معاملات میں اسلامی نظام حکومت انسانی حقوق و فرائض، اقتصادیات، سرمایہ داری، غربت اور غلامی وغیرہ کے متعلق اسلامی تعلیمات

کا موجودہ نظام سے موازنہ کرکے دکھایا گیا ہے، کہ دنیا کی فلاح کے لئے اسلامی تعلیمات ہی مفید ہیں، آخر میں شرعی علوم کی تاریخ پر تبصرہ ہے، کہ انہیں کس طرح صحابہ کرام نے رسول اللہ صلعم سے حاصل کیا، کس احتیاط کیساتھ تابعین کو اور انھوں نے تبع تابعین کو پہنچایا، مدینہ اور کوفہ کے علماء نے مذہبی علوم کی کیا خدمت کی، سلف صالحین اور محدثین نے اسکے تحفظ میں کتنی احتیاط برتی، محدثین اور فقہاء میں کس طرح اختلاف کا آغاز ہوا، اس اختلاف کی حیثیت کیا ہے، پھر کس طرح عقائد میں موشگافیاں پیدا ہوئیں، اور انھوں نے معتزلہ خوارج قدریہ اور جبریہ وغیرہ مختلف فرقے پیدا کئے، اس ضمن میں تیسری صدی ہجری تک کے بعض بڑے اسلامی فرقوں، ان کے بانیوں، ان کے عقائد اور اس سلسلہ کے پیش آمدہ واقعات کے اجمالی حالات ہیں، یہ کتاب کے مباحث کا اجمالی خاکہ ہے، اس کے وہ مباحث جن کا تعلق اسلام کے مادی نظام سے ہے دلنشیں ہیں، لیکن مذہب کی مابعد الطبعی تعلیمات اور فلسفیانہ مسائل کی بحثیں آجکل کے ذوق کی تشفی کے لئے کافی نہیں ہیں کیونکہ ان کی بنیاد تمامتر پرانے فلسفہ پر ہے، جسکی اس زمانہ میں کوئی قیمت نہیں،

بغداد عہدِ عباسیہ میں، مولفہ جناب عثمان علی مرزا صاحب تقطیع چھوٹی، ضخامت ۴۰ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت اوسط قیمت ۴ر، غلام دستگیر تاجر کتب گلزار حوض حیدرآباد دکن،

جیسا کہ اس رسالہ کے نام سے ظاہر ہے، اس میں عباسی عہد کے بغداد کی علمی، تعلیمی، تعمیری، صنعتی، تجارتی، جملہ تمدنی ترقیوں کے مختصر حالات دکھائے گئے ہیں، یہ حالات اردو کی بہت سی تصانیف اور ترجمہ شدہ کتابوں میں ہیں، لائق مرتب نے ان کو چن کر سلیقہ کیساتھ اس کتاب میں جمع کر دیا ہے، اردو کتابوں کے علاوہ بعض انگریزی اور عربی کتابوں سے بھی مدد لیگئی ہے، رسالہ دلچسپ اور مفید ہے،

جامِ طہور، جناب اثر صہبائی، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۱۱۰ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت مرقوم نہیں، پتہ تاج کمپنی لمیٹڈ، لاہور،

جناب اثر صہبائی کے لئے کسی تعارف کی ضرورت نہیں، ان کے کلام کے متعدد مجموعے شائع ہو چکے ہیں، ارباب ذوق ان سے آشنا ہیں "جام طہور" ان کی رباعیات کا تازہ مجموعہ ہے، گو صہبائی صاحب ہر صنف سخن میں کامیاب طبع آزمائی کرتے ہیں لیکن حقیقۃً اور فطرۃً وہ رباعی گو ہیں، اور اس میں بہت زیادہ کامیاب ہیں، ان کی شاعری پر اردو، فارسی اور انگریزی کے مختلف شعرار کا اثر پڑا ہے، اسلئے ان کے خیالات میں تنوع اور رنگا رنگی زیادہ ہے، رباعیات میں بھی یہ تنوع نمایاں ہے، ان میں عرفان و حکمت کے موتی بھی ہیں، اخلاق و موعظت کے درس بھی، باغ و بہار کی رنگینی بھی ہے، اور بادہ و ساغر کی مستی بھی، غرض اس جام طہور میں ہر رنگ اور ہر مزہ کی شراب موجود ہے، ابتدا میں وہ زبان کی صحت کا اہتمام نہیں کرتے تھے، اس لئے اس حیثیت سے ان کے کلام میں بعض فروگذاشتیں نظر آتی تھیں، لیکن مشق و مہارت کے ساتھ ساتھ زبان میں سادگی اور صفائی آتی جاتی ہے، یہ مجموعہ ظاہری اور معنوی دونوں خوبیوں سے مزین ہے، ارباب ذوق کو اس سے لطف اٹھانا چاہئے،

یادگار محشر، عبید اللہ محشر تیمی مرحوم، تقطیع چھوٹی ضخامت ۴۸ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت اور پتہ مرقوم نہیں،

عبید اللہ تیمی مرحوم بستی کے ایک نوخیز اور ہونہار شاعر تھے، ابھی وہ اتنے نوعمر تھے، کہ لوگ اُن سے واقف بھی نہ تھے لیکن ان کے کلام سے اندازہ ہوتا ہے، کہ ان میں شاعری کی فطری صلاحیت تھی، اگر وہ زندہ رہتے، تو ایک دن یقیناً ان کا شمار اچھے شعرار میں ہوتا، لیکن افسوس ہے کہ موت نے اس ہونہار شاعر کو اس کا موقع نہ دیا، یادگار محشر مرحوم کے کلام کا مختصر مجموعہ ہے، ابتدا میں ان سے اور ان کی شاعری سے متعلق ان کے احباب بزرگوں اور جاننے والوں کی تحریریں ہیں، جن میں بعض ادیبوں کے نام بھی نظر آتے ہیں،

"م"